UnEven Page Numbers within the book only

۷۸۶

انجمنِ معینُ الادب کا علمی و ادبی

ماہوار رسالہ

ادبستان

مُرتّب
رشید صدیقی

مُعاوِن
منیر الہ آبادی

مُعاوِن
خلیل احمد سیکروی

قیمت سالانہ چار روپیہ، ششماہی دو روپیہ آٹھ آنہ

پتہ
دفتر رسالۂ ادبستان، ۱۶۳۔ دادر مین روڈ بمبئی ۱۴

ادبستان

جلد ۱ | ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ عیسوی | نمبر ۱

فہرست مضامین

بزم ادب

(آغاز)

بنام جہاندار جاں آفریں
حکیم سخن در زباں آفریں

الحمدللہ کہ "ادبستان" کا پہلا پرچہ ناظرین کے سامنے پیش ہے۔ یہ تعبیر ہے اس "خواب پریشاں" کی جسے "دیدۂ دل" و "چشم دماغ" عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بسم اللہ ہے اس "طفل دل" کی جس نے "امیدوں" کی آغوش میں پرورش پائی اور "ارمانوں" کے دامن میں کھیلا۔ یعنی یہ اس "تعمیر" کا "سنگ بنیاد" ہے جسے "ذوق سلیم" کی جولانگاہ بنانے میں ہر امکانی کوشش سرگرم کار ہے۔

اگرچہ اس "علمی وادبی رسالہ" کو صحیح معنوں میں "علمی وادبی" اور "ادبستان" کو درحقیقت "ادبستان" بنانے میں کوئی کوشش فروگذاشت نہیں کی گئی ہے۔ تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ اہل نظر کو اس میں بہت کچھ خامیاں نظر آئینگی اور امید ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے گرانقدر مشوروں سے سرفراز فرماتے رہیں گے۔

مقام مسرت ہے کہ ابنائے وطن اردو کی طرف خاص دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کی ترویج واشاعت میں کوشاں ہیں۔ ملک کی موجودہ حالت کا اگر گذشتہ چند سالوں سے مقابلہ کیا جائے تو ایک نمایاں فرق نظر آئیگا۔ اس وقت ہندوستان کے تقریباً ہر گوشہ سے کوئی نہ کوئی اردو رسالہ نکل رہا ہے اور آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس حیثیت سے ملک نے جتنی ترقی کی ہے اقتصادی حیثیت سے اتنا ہی (بلکہ اس سے زیادہ) تنزل ہوا ہے۔ جب بقول حضرت اکبر الہ آبادی نوبت یہانتک پہونچ گئی ہو۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر ہم نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

تو افکار زمانہ سے کسے فرصت جو اس طرف توجہ کرے۔ ہر شخص پریشانئ روزگار کا شکار۔ تن پروری کی فکر میں مبتلا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف اخبارات ورسائل کی تعداد اعتدال سے متجاوز ہو چکی ہے۔ قوم میں جہل و مفلسی کا دور دورہ۔ پھر ان کی قدر کون کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر معاصر "راہ ادب" سے بھٹک کر "راہ عدم" کو سدھارتے ہیں۔ چنانچہ ہر نئے اخبار یا رسالہ کے متعلق اب یہ ایک عام خیال ہو گیا ہے کہ "دیکھئے یہ کے روز چلتا ہے" اور اس میں شک نہیں کہ اس خیال میں حقیقت کو ایک بڑی حد تک دخل ہے۔

ان حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے اس وقت ملک میں جتنے پرچے موجود ہیں نہایت غنیمت ہیں اور ان میں ہر ایک کسی نہ کسی خاص مقصد کی تکمیل کر رہا ہے۔ اب ان میں بحالات موجودہ کسی اضافہ کی گنجائش یا ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن "ادبستان" کا اجرا جن واقعات اور اغراض کے ماتحت ہو رہا ہے وہ اس کے وجود کے متقاضی تھے۔

"انجمن معین الادب" جس کا یہ رسالہ ماہوار آرگن ہے ایک "علمی مجلس" کی حیثیت سے "محض اُردو کی خدمت" کے لئے ظہور میں آئی۔ انجمن کو "ادبستان" کے اجرا سے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ بلکہ صرف "خدمت زبان" اس کا کافی صلہ ہے۔

"ادبستان" کی زندگی کا مقصد خاص یہ ہے کہ اردو کو ملک کی دوسری زبانوں سے "روشناس" کرایا جائے دیگر ہموطن زبانوں کے "کمالات" کا مشاہدہ کیا جائے۔ ان کے اہل علم حضرات کے "جذبات وتخیلات" کا اندازہ لگایا جائے۔ ان کے "سورماؤں" کے دم خم آزمائے جائیں۔ اور بجائے اس کے کہ ہم سات سمندر پار کی زبان کے "سرمایۂ ناز" کو اپنے لئے "باعث فخر" سمجھیں۔ اپنے ہی دیس کی زبانوں سے رشتۂ ارتباط قائم کریں اور ان سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔

علاقہ بمبئی چونکہ مرہٹی اور گجراتی زبانوں کا گہوارہ ہے اور عام طور پر یہی دو زبانیں یہاں رائج ہیں اس لئے ہم پہلے انہیں دونوں زبانوں کے "سرمایہ" کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے ۔

"ادبستان" کی پالیسی کے متعلق ہم صرف اس قدر عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ سوائے ان مضامین کے جو قابل اعتراض باتوں یا ذاتیات سے لبریز ہوں۔ اس کے صفحات ہر قسم کے مضامین کے لئے کھلے ہوئے ہیں ۔ البتہ اس حد تک نہیں کہ یہ لوگوں کے تالیف قلوب کا ذریعہ بن جائے ۔

ہم ان تمام حضرات کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہمیں "تشنگی" مضامین عنایت فرمائے ہیں ۔ اس سلسلہ میں مولانا قمر احمد صاحب مولانا وحید الدین صاحب سلیم ۔ راجہ غلام حیدر خانصاحب مولانا اظہر ترمذی، مولانا محمود اسرائیلی اور مسٹر سلیم الحق صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ حصۂ "نسائیات" میں ریحانہ خاتون صاحبہ عباسی اور ع ۔ ص ۔ صاحبہ کے مضامین اعلیٰ اور مفید ہیں ۔ فرمودہ بیگم صاحبہ کی لغت بھی خوب ہے ۔ ہم ان بہنوں کے ممنون ہیں ۔

ہمیں امید ہے کہ یہ حضرات اور ملک کے دیگر اہل قلم حضرات ہماری امداد سے گریز نہ فرمائیں گے اور یہ سلسلۂ "عنایات" ہمیشہ جاری رکھیں گے۔

مجھے اپنی بے مائیگی اور ہیچمدانی کا اعتراف ہے اور "ادبستان" کے اعلیٰ معیار کو دیکھتے ہوئے اپنے کو اس کے "مرتب" ہونے کا کسی طرح اہل نہیں پاتا ۔ لیکن احباب کی "کرم گستری" سے یارائے "محرومی" کہاں ؛

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یاران دیرینہ کی نظر انتخاب کو کیا کہا جائے ۔ کاش احباب انجمن معین الادب اس سالہ کے لئے کسی بہتر "ایڈیٹر" کی تلاش کرتے ۔

بہر حال میں اراکین انجمن کا مشکور ہوں ۔ جنہوں نے "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کی مصداق اس اہم کام کی ذمہ داری میرے کمزور ہاتھوں پر رکھی ہے ۔ خدا اس کا اہل ہونے کی

کویل

(از مولانا محمود اسرائیلی رکن ادارت ہمدرد دہلی)

اے زینتِ بہار
اے جانِ کوہسار
اے حسنِ لالہ زار!
فطرت کے رازدار
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟

اے مطربِ چمن!!
گر تو ہو نغمہ زن!!
ہر شاخِ گلبدن
چومے ترا دہن!!
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟

ہر برگِ جاں فزا
ہو جھومتا ہوا!!
ہو رقص میں صبا!!
سُنکر تری صدا!
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟

گلشن ہے پُر فضا!
ہر گل میں ہے ادا!!
اور چھائی ہے گھٹا!
نغمہ کوئی سُنا!!
اے موسمِ بہار کے قاصد کہاں ہے تو؟

"ترکی مناظر نمبر ۹"

شیخ فاضل کی نمک حرامی (غداری)

(مترجمہ محمد سلیم الحق صاحب حقی دہلوی بی۔ اے علیگ)

مگادر سٹرک پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بیسیوں مرد، عجیب عجیب وضع کا لباس پہنے اس شاندار سنگین مکان میں داخل ہو رہے تھے جو کہنے کو تو الجیریا و تیونس کے پیرس وارد طلباء کے آرام و استفادہ کی غرض سے قائم تھا۔ لیکن واقعتاً جمہوریت فرانس کے "دفتر عربیہ" کا صدر دفتر تھا۔ یہ دفتر شہنشاہیت پسند فرانسیسیوں کی اختراع تھا۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح مشرقی وسطی عرب میں ترکوں کا زور اور اقتدار گھٹا کر فرانس کے "پرامن داخلہ" کے لئے راستہ صاف کر لیا جائے۔ تاکہ کچھ عرصہ بعد یہ جمہوریت تمام عربی داں ممالک پر قابض و متصرف ہو کر بحیرۂ روم میں ہر طرف پھیل جائے۔ یہ تجویز بلاشبہ نہایت درجہ حریصانہ تھی، لیکن چونکہ بفضلہ تعالےٰ فرانس مغربی اور شمالی افریقہ میں مقبوضات حاصل کرنے میں معقول کامیابی حاصل کر چکا تھا اس لئے ازمنۂ ماضی و حال کی نہایت زبردست شاہی طاقتوں کا رقیب بننے، اور ان جیسی عظمت و شان حاصل کرنے کا خیال، فرانس کے دلیں بھی گدگدیاں پیدا کرنے لگا تھا۔

آج کا مجمع زیادہ تر عرب نژاد افراد پر مشتمل تھا، تاہم متعدد فرانسیسی، الجیردی، اور کچھ نوعمر، یوروپی لباس میں ملبوس نوجوان بھی، جو بلا تکلف شستہ عربی بول سکتے تھے اس جلسہ میں شریک دکھائی دیتے تھے۔ مقررہ وقت پر نقیب عذوری تقریر گاہ پر چڑھا اور اس نے نجم بستانی کا نام جلسہ کی صدارت کے لئے پیش کیا۔ نجم بستانی جو تقریباً ساٹھ سال کا تھا اور نگاہوں سے معلوم

ہوتا تھا کہ بڑا عالم و فاضل شخص ہے۔ تقریر گاہ پر پہنچا اور کچھ دیر بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ آج پان عربک (معادنِ اعراب) کانفرنس کا افتتاح ہوتا ہے؟ اس نے تمام عربی داں ممالک کے نام پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ مصر، عراق، فلسطین اور شام کے نمائندے شریک جلسہ ہیں۔ ایک کثیر تعداد ان نمائندوں کی بھی تھی جو امریکہ میں بود و باش رکھنے والے عربوں کی طرف سے آئے تھے۔ اور فرانسیسی افریقی مقبوضات سے بھی ایک زبردست گروہ آکر ان سب میں شامل ہوگیا تھا۔ پچھلی کرسیوں پر محکمہ خارجہ کمیشن کے مقتدر فرانسیسی افسر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر ظاہر تھا کہ دراصل اس جلسہ کی روح رواں اور کارکنانِ جلسہ کو تگنی کا ناچ نچانے والے یہی چند افسر تھے۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بستانی نے ایک طویل تقریر کی جسمیں اس نے عربوں کی شاندار فتوحات، اور میدانِ علم و ادب و سائنس اور فنون حرب و معمورات میں ان کی عظمت و کامرانی کا تفصیلوار ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ "عرب کوئی مخلوط قوم نہیں بلکہ وہ ایک متحد و مجتمع قوم ہے۔ اور باہمد گر متفق و متحد ہو کر اپنی حکومت آپ کر سکتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے ہمیں یاد نہیں کہ (یہاں صدر جلسہ نے غصہ اور خفگی کا لہجہ اختیار کر لیا) دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی اور رنج و افسوس کی بات ہوسکتی ہے کہ یہی مقتدر قوم ایک ایسی قوم کے پاؤں تلے روندی جارہی ہے جسے ترک کہتے ہیں اور جس کے مورثِ اعلیٰ بعض مشہور تاریخی عرب تاجداروں اور ذوی الاقتدار کجکلاہوں کے زر خرید غلام تھے؟ ہم غیر ملکی حکومت کی برداشت کر سکتے ہیں اور اگر عرب قومیت غیر ملکی حکومت ہی کی دلدادہ ہو تو ہم ترکوں کے علاوہ ہر غیر قوم کی حکومت پر صبر و سکون سے کام لے سکتے ہیں! مثلاً —— میں محض آمد سخن کے طور پر کہتا ہوں کہ مثلاً ہم غالباً فرانسیسی حکومت کو پسند کریں!" اس فقرہ پر پچھلی صف کے کرسی نشینوں میں سے ایک نے چلا کر فوراً کہا کہ "کوئی فرانسیسی اس سے زیادہ اور کوئی خواہش نہیں رکھتا کہ آزاد عرب قوم اپنی حکومت آپ کرے!" بستانی نے کہا کہ "ہمیں انجمن اتحاد و ترقی سے بہت کچھ امیدیں تھیں مگر افسوس کہ اس انجمن نے بھی ہمیں مایوس ہی رکھا؛ ہمیں اصلاحات کے وعدوں پر بہت کچھ بھروسہ تھا لیکن یہ وعدے بھی پورے نہ ہوئے۔ اور شاید کبھی بھی پورے نہ ہوں! "ترک و عرب" مفاہمت جسمیں

جسمیں حسب دستور عربوں کا ترکوں کے زیر اثر رہنا تجویز ہوا' ایک بے ضابطہ کار روائی ہے اور اسکا فوراً دائمی انسداد ہو جانا ضروری ہے۔ اب ہماری نظریں (مقرر نے اپنی زبردست تقریر کے خاتمہ پر کہا) فرانس پر لگی ہیں کہ وہ ہمیں ہمارے مقاصد میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم کسی غیر سے استمداد کریں' ہم فرانس کی مدد کے طالب ہیں۔ کیونکہ یہ ملک مساوات آزادی اور اخوت کا زبردست حامی اور طرفدار ہے"

یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ مقرر نے محض عمومی باتوں کا ہی تذکرہ کیا۔ کیونکہ اگر بدقسمتی سے وہ مبہم طور پر بھی الجیریا اور تیونس میں فرانسیسیوں کی ریشہ دوانیوں اور کارگذاریوں کا ذکر کر دیتا تو ابتدا ہی سے اس "معادن اعراب" تحریک میں فتور واقع ہو جاتا۔ اور بقول کسیکہ "بسم اللہ ہی غلط" ہو جاتی۔ لیکن جائے مسرت ہے کہ مقرر نے ایسا نہیں کیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اس قسم کا حوالہ دینے کے خطرات سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی تقریر میں شروع سے آخر تک وہ محض ترکوں کا مذاق اڑاتا رہا اور انپر فقرے چست کرتا رہا۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی اور بات' کسی قسم کی بالکل بیان نہ کی۔

ایک اور مقرر بھی تھا جو اس "پان عربک ڈرامہ" میں اسٹیج کی روح رواں تھا۔ یہ شخص بھی صدر جلسہ کی طرح مارونی (نواح لبنان کا باشندہ) تھا۔ اور اس نے فرانس ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی اسکا نام نقیب عذوری تھا۔ اور اس کے خیال میں فرانس منتخب خلایق ملک تھا۔ جس کی زبان' طور' طریقے' اور تہذیب و تمدن سیکھنا گویا انسانی زندگی کا بہترین مقصد تھا۔ نقیب کے خیال میں فرانسیسی شورش (۱۷۸۹ء کا غدر) گویا ایک عمدہ نمونہ تھی۔ اور ترکی انجمن اتحاد و ترقی گویا اس شورش کی بداصل اولاد تھی۔ تو نقیب عذوری سرتاپا توہم پرست تھا۔ اور ترکوں کے خلاف اسقدر زہر اگلنے میں وہ معمولی تہذیب اور فہم و فراست' کی حدود سے بھی تجاوز کر گیا۔ اس نے بیان کیا کہ "مذہب پرستی تمام مشرقی اقوام پر ایک عذاب الٰہی ہے اور معادنین اعراب کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ ان لوگوں کی جو صرف ایک قسم کے مظالم سے تنگ آکر دوسری قسم کا عذاب مول لینا چاہتی ہیں ہرگز رد رعایت نہ کریں۔ ہم انسانی حقوق کے دلدادہ ہیں اور ہم ہرگز ان عرب صاحبان کی مساعی جمیلہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو آج بھی محض مذہبی نقطۂ نظر سے متحدہ عرب عظمت و جبروت کی شاندار عمارت استوار

کرنا چاہتے ہیں۔" عذوری اپنی تقریر میں عربوں کی غیرت وحمیت کو جوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ خود جوش میں آتا جاتا تھا۔ حاضرین زیادہ نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ مسلمان عرب ہرگز اس صورت حالات کو پسند نہ کریں گے جو فی الوقت اس جلسہ میں رونما ہو رہی تھی۔ اس شخص کی تقریر ختم ہوتے ہی تقریباً چھ سات آدمی تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ انہی ساتوں میں بستانی کی نظر شیخ صالح پر پڑی جو شامی مسلمانوں کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ اور فلسطینی اور حجازی بدّو امیروں میں بہت معزز و ممتاز تھا۔ بستانی نے شیخ صالح کو اشارہ سے تقریر گاہ پر بلایا اور موخر الذکر نے کہنا شروع کیا: "ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم عربوں میں اتفاق و اتحاد قائم رکھیں۔ ہم ترکوں کے محض اس لئے خلاف ہیں کہ وہ ظالم اور جابر ہیں۔ ورنہ ہماری مخالفت کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ ہم مذہبی طرز حکومت کو مٹا کر دنیاوی طرز حکومت قائم کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اگر ہم نے ایسا کیا، یا اگر ہم ایسا کرسکتے ہیں تو ہمیں عربستان کے تمام قدیم و مشہور خاندانوں کے نامور معزز افراد کی امداد سے قطعاً ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔" اس صلح جو معتدلانہ تقریر پر ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین و آفرین بلند ہوئے۔ اور فرانسیسی کمیشن کے ایک نمائندہ نے بعجلت تمام حاضرین کو یقین دلایا کہ کسی شورش و فساد کی کامیابی ہی اس کے ممکن العمل ہونے کی دلیل ہے محض تقریروں سے کیا نتیجہ مرتب ہوسکتا ہے۔ شیخ صالح کی تقریر نہایت فاضلانہ اور مدلل تھی۔ اور کانفرنس کے لئے مناسب یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اکثریت کی نظروں میں وقیع بنی رہے۔ کیونکہ حقیقتاً یہی لوگ ترکوں کے خلاف عربوں کی صدائے احتجاج کے اصلی موئد و معاون تھے۔

افتتاحی تقریروں کے بعد کانفرنس ایک منتخب کمیٹی کی صورت میں منتقل ہوگئی اور بہت سی تجویزیں پاس ہوئیں شام کے وقت کانفرنس کے تمام نمائندے اپنے فرانسیسی دوستوں کے مہمان ہوئے اور ایک شاندار پر تکلف دعوت پر مدعو کئے گئے۔

شیخ صالح جو قریش پارٹی کی طرف سے منتخب ہوکر آیا تھا۔ شام کے وقت اپنے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عجیب الہیئت شخص خوب اوڑھے لپیٹے منہ ہاتھ چھپائے اس کے پاس آیا۔ نو وارد کا نام محمد عبداللہ تھا۔ وہ فرانسیسی نو مسلم تھا۔ اور وزارت خارجہ کا معتمد ایجنٹ۔ "عبداللہ"

نے شیخ صالح کے سامنے بعض خاص تجاویز پیش کیں اور کامل خلوص و اعتماد ظاہر کرنے کے طور پر اُس نے کرنسی نوٹوں کا ایک پلندہ سامنے میز پر ڈالدیا۔ شیخ موصوف نے استحساناً ان قیمتی کاغذوں کو دیکھا اور مسکرایا۔ دونوں میں (نووارد اور شیخ موصوف) کچھ راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں وعدے وعید ہوئے۔ اور قول و قرار لیکر عبد اللہ ہوٹل سے واپس ہوا۔ (باقی آئندہ)

غزل

(از سید محمد ہادی دہلوی)

ہوگیا وجہ جنون عشق کا چرچا مجھ کو
دیکھیے کیا کرے یہ سوزشِ سودا مجھ کو

آنکھیں پتھرا گئیں دل ہجر سے بیتاب ہوا
ابتو دکھلا دو خدا را رُخِ زیبا مجھ کو

اس کی زلفوں کا بکھرنا تھا قیامت آئی
ہوگیا مجھ کو جنوں ہوگیا سودا مجھ کو

گلیوں گلیوں نہیں برسائے پتھر مجھ پر
کوچہ کوچہ نہ کیا عشق نے رسوا مجھ کو

گلیوں گلیوں نہیں کیا تنکے چنائے مجھ سے
جا بجا کیا نہ کیا عشق نے رسوا مجھ کو

نگۂ ناز ادھر حل کہ تماشائی ہوں
تیر کا کام کرے ایک اشارہ مجھ کو

وصل کے ذکر پہ غصّہ سے وہ فرماتے ہیں
دل سے بھاتا نہیں یہ روز کا چرچا مجھ کو

شیخ جی مے کی مذمت تو کیا کرتے ہو!
تم اکیلے کبھی گلیوں میں نہ ملنا مجھ کو

ہادی یہ عشق فرنگن ہے مسلمانی میں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دو چار کلیسا مجھکو

جج۔ تمہیں کیسے معلوم کہ یہ عورت مدعی کی بیوی ہے۔
گواہ۔ حضور میں نے اسے اس کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں۔

مذاق شاعری

(از مولانا حاجی قمر احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈیٹر روزنامہ خلافت)

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسیؔ، کلام ناکارہ

یہ تو سب پر ظاہر ہے کہ اردو زبان کو دنیا کی زبانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہوئے ابھی پوری دو صدیاں بھی نہیں گذریں، نیز اردو جہاں اول رائج ہوئی وہاں پہلے فارسی کا رواج تھا جس کے باعث نہ صرف اردو شاعری بلکہ جملہ اصناف ادب اردو پر فارسی ہی کا اثر نمایاں ہوا۔ مسلمان چونکہ اپنے زمانۂ حکومت میں فارسی ہی کو ملکی زبان بنائے ہوئے تھے اور ملک کی خاص خاص دوسری زبانوں کے حصول سے گھبراتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محض زبان فارسی کی پیدا کردہ ملکی فضا کے اثر سے متاثر ہو کر بلا دیکھے "کنار آب رکن آباد و گل گشت مصلےٰ" سے لطف زندگی حاصل کرنے لگے؛ صحرائے نجد میں بگولوں کے ساتھ آہوان وحشی کی طرح دوڑ کے مزے لینے لگے، اور بلا سوچے سمجھے کوہ بیستون سے جوئے شیر لانے کی فکر میں پڑ گئے۔ ہندوستان کی فلک پیما پہاڑیوں کا خیال تک نہ آیا۔ راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستانوں میں بھول کر بھی صحرا نوردی کا حوصلہ نہ ہوا۔ خود ہندوستان جنت نشان تھا۔ مگر ہم ہمیشہ گلشن ایران پر جان دیتے رہے۔ دریائے جیحوں و جوئے مولیاں کی یاد میں سر دھنا کئے، کبھی گنگا جمنا پر دل نہ لہرایا۔ غرضیکہ ہمارے ذوق سلیم کی گنگا الٹی بہتی رہی۔ جس کا یہ انجام ہوا کہ آج اردو کی شاعری خلاف فطرت، تصنع اور بناوٹ سمجھی جارہی ہے، ہم نے کبھی اپنے وطن کے پھولوں کو دنیائے شاعری میں کھلنے نہ دیا۔ ہمیشہ ایران کے سُنے سنائے پھول پر بلبل صفت نثار ہے۔ تشبیہ، استعارات، غرضیکہ شاعری کا ہر جزو کل فارسی کا رہین منت، سنسکرت

تو ہمارے لئے ایک کا واک زبان بھی ہی ہم نے تو ملکی اور صوبہ جاتی، ورنا کیولرشل بھاکا بنگلہ پنجابی، گجراتی مرہٹی وغیرہ کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج اردو شاعری اپنی تمام ہمسایہ زبانوں کی شاعری سے بیگانہ اور غیر مانوس سی ہے۔ جو سچ پوچھئے تو یہ بہت بڑی کمی ہے اور جس کا پورا کرنا ہمارے قومی ہونہار نوجوانوں کا فرض ہے۔

اس موقع پر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ کوشش کبھی نہ کبھی ضرور ہوا کی۔ کہ اردو زبان کو مقامی زبانوں سے بالکل بیگانہ نہ رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو، مرزا عبدالرحیم خانخاں۔ ملک محمد جائسی، انشاء اللہ خاں اور ایسے ہی متعدد نام ہمیں ملتے ہیں۔ مگر ان کی کوششیں محض انفرادی کوششیں ہیں جو ان کے نام کے ساتھ، یا وقتی جوش کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ اور اس زمانہ میں تو اردو اور ہندی کے جھگڑے نے ایک ایسی ناگوار صورت اختیار کرلی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں زبانیں کبھی ملیں گی ہی نہیں۔ حالانکہ اسی ملک میں ہمارے بچے" یوں پڑھتے آئے،

خالق باری سرجن ہار واحد ایک خدا کرتار
رسول پیمبر جان بسیٹھ یار دوست بولی جا ایٹھ
مولوی صاحب سرن پناہ گدا بھکاری خسرو شاہ

یا پھر یہ صدا کانوں میں آئی:۔

ایک تو نینا مد بھرے دوجے انجن سار اب یوری کو دیت ہے باور کو تھیار

جیسے فارسی میں یوں پڑھا جاتا ہے:۔

یکے چشم سیہ داری، دگر سرمہ چھا کردی برائے کشتن عاشق بلا اندر بلا کردی

یا یہ سنتے۔ کہ

جو میں ایسا جانتی کہ پیت کئے دکھ ہوئے نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت نہ کیجو کوئے

جس کا ترجمہ یوں کیا جاتا:۔

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را   نمی کردم بدل روشن چراغ آشنائی را

جس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگریزی زبان میں ہومر اور دوسرے قدیم شعرائے یونان کی نظموں کے ترجمے نظم میں موجود ہیں تو بیساختہ دل یہ چاہتا ہے کہ کاش آج اردو میں رامائن اور مہابھارت کے منظوم ترجمے اسی پایہ کے ہوتے، تاکہ اردو شعرا کو ہندی شعرا کا کمال اور ہندی شاعری کی خوبیاں معلوم ہوتیں۔ اور وہ یہ سمجھ سکتے کہ ان میں سے کون کون سی باتیں قابل قبول ہیں اور واقعی نیچرل شاعری کسے کہتے ہیں۔ اس موقع پر اردو شعرا فخر کے ساتھ میر انیس مرحوم کو پیش کرینگے ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی بتائیں گے کہ میر انیس صاحب کے یہاں ایک گریہ و بکا میں تو ضرور لکھنؤ بلکہ ہندوستان کا نقشہ سامنے آتا ہے، باقی ساری شاعری کا ٹھاٹھ بدیسی اور فارسی کا ممنون احسان ہے۔ یہ امر کسی اعتراض کی رو سے نہیں عرض کیا جاتا۔ بلکہ یہ ایک امر واقع ہے، جس کے ذمہ دار اردو کے شعرا نہیں۔ بلکہ وہ فضا ہے جس نے انھیں ہندوستانی دوسری زبانوں سے بیگانہ رکھا۔

مرحوم میر انیس صاحب کے یہاں تو پھر بھی ہندوستانی تلمیحات مل جاتی ہیں، جو شعرائے ریختہ کی نگاہوں میں خار بنکر کھٹکتی ہیں۔ مثلاً آپ ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ کہ

چھیدوں دل ارجن جو کروں تیر کو پرتاب،

ایسی ہی اور بھی مثالیں ہیں۔ مگر اس معاملہ میں سب سے زیادہ قابل مواخذہ موجودہ نسل ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کی نظمیں ساری دنیا کی زبانوں میں ترجمہ ہوگئیں۔ اور نہ ہوئیں تو اردو میں، (ترجمہ سے مراد اعلیٰ قسم کا منظوم ترجمہ ہے۔ گھٹیا قسم کی نثر میں ادائے مطلب نہیں) بلبل ہند مسز نائیڈو کی نظمیں ساری مہذب دنیا میں گائی جاتی ہیں۔ مگر نہیں گائی جاتی ہو تو اردو میں ترجمہ ہوکر۔ بمبئی کے شعرائے اردو کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ گجرات اور مہاراشٹر میں کون کون صاحب فن (کوی شاعر) ہوگزرے ہیں۔ اور اُن کا کلام کیوں اس درجہ مقبول ہے۔ یقیناً آنیوالی نسلیں موجودہ نسل کی اس غفلت اور بےخیالی پر اونھیں کچھ بہت اچھا نہ سمجھینگی۔ مگر اس کی تلافی

اب بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے انجمن معین الادب اور اس کے ماہوار ادبی و علمی رسالہ ادبستان سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے، اور اردو خواں پبلک کے سامنے کم از کم بمبئی کی مروجہ زبانوں یعنی گجراتی اور مرہٹی کے شاعرانہ خیالات پیش کرنیکا اہتمام کریں گے۔ تاکہ گل و بلبل کے فرضی داستانہائے عشق کے بجائے ہم آم کی ڈالی پر کوئل کی پُر درد کوک سُن سکیں۔ نجد کے میدان میں قیس عامر کے ساتھ لیلیٰ کی محمل کے پیچھے بہت خاک اڑا چکے، اب وقت ہے کہ پنجاب کے ہیر و رانجھا کی داستان ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اس نئی انجمن معین الادب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور ادبستان کی کامیابی کیلئے دعاگو ہوں۔

افکارِ پریشاں

(از جناب عبدالشکور صاحب شیدا)

ہر شے میں ترا جلوہ پنہاں نظر آتا ہے — عالم مری آنکھوں میں عُریاں نظر آتا ہے

پھر یاد کوئی آیا، آنکھوں میں بھرے آنسو — پھر دیدۂ پرنم میں طوفاں نظر آتا ہے

صحرائے تصور میں کچھ نقش خیالی ہیں — اب ڈھونڈنا منزل کا آساں نظر آتا ہے

شاید کہ گلستاں میں پھر فصل بہار آئی — گہوارۂ وحشت پھر جنباں نظر آتا ہے

خود نذر تماشہ ہو، پھر دیکھ تجھے شیدا
ویرانہ میں بھی کیسا ساماں نظر آتا ہے۔

انتخابات

دعائے نیم شبی

(از جناب سلطان حیدر جوش)

آنریبل ایم۔ سی۔ (ممبر آف دی کانسل) کچھ عرصہ سے، اس وقت سے جبکہ وہ کونسل کے ممبر منتخب ہوکر آنریری مجسٹریٹ کے علاوہ آنریبل اور ایم۔ سی۔ بھی ہو گئے، بلاناغہ آدھی رات کے سنّاٹے میں اپنے دردِ دل کا اظہار کچھ ایسے موثر الفاظ میں کیا کرتے ہیں، جو سننے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔

"اے پارلیمنٹ اور کونسل کے خدائے صغیر! اے وہ خدا جس کو سوائے دنیاوی ترقی کے پروردگار عالم سے کچھ مطلب نہیں! میں اپنے سچّے دل کے ساتھ تجھ سے اور محض تجھ سے ملتجی ہوں کہ تو اپنی نگاہِ لطف آمیز مجھ ناچیز پر، اپنے بندۂ خاص پر، ڈال! رحم و مہربانی آمیز نظر کے ساتھ اس عظیم الشان اور حیرت انگیز اتفاق کو ملاحظہ کر، جس نے مجھے کونسل کے آنریبل ممبر بنجانے کا موقع دیا۔ اور اپنی شانِ عیب پوشی و ابلہ نوازی کے صدقے میں، اپنے دامانِ عنایت میں۔ اپنے حفاظت اور طرفداری کے وسیع دامن میں چھپالے، تاکہ میری جہالت، میری از سر تا پا قابلیت، کسی عیب جو اور نکتہ چیں نظر کو بھی نہ معلوم ہو سکے! قسم ہے تجھ کو اپنے قوتِ تکلم کی، اپنی طاقتِ لسانی کی، مجھ بے زبان میں کم از کم اتنی تو لیاقت پیدا کر دے کہ میں اس جرنلسٹ اور پریس رپورٹر کے پھندے سے نکلجاؤں جو میری اسپیچ اور تقریر کے لکھنے اور اصلاح کرنے کا معاوضہ وقت آنے سے پہلے مجھے یاد کرانے اور رٹوانے کا مطالبہ میری استطاعت سے بھی زیادہ مانگتا ہے!!

اے مذہبی فرقوں، سوشل گروہوں، اور پولیٹکل جماعتوں پر حکمرانی کرنے والے خدائے خاص! اپنے زرنگار چکاچوند پیدا کرنے والے جڑاؤ عرش کے صدقہ میں میرے دل و دماغ کو بذریعہ اسپریچوئل ٹیلیگرافی، یا روحانی تار برقی عام واقفیت سے صرف اس قدر بھر دے کہ میں وقتاً فوقتاً حلقہ رائے

دہندگان کے روبرو ہر پیش آنے والے معاملہ میں دخل درمعقولات کرسکوں۔ اور ان بیوقوفوں کو جو گورنمنٹ کی اطاعت کے محض ایسے ہی عادی ہیں جیسے ہولی کے موقعہ پر برانڈی یا رم کے، ہر مسئلہ پر اپنی جھوٹی سچی ٹانگ لڑانے سے اپنا گرویدہ بناؤں۔ مجھے معلومات باطل اور حقوق فرضی کی ایسی عمیق تعلیم دے کہ میں اس کی بدولت اپنے گرد و پیش رہنے والے ناتراشیدہ دہقانیوں کو اپنی وسیع معلومات اور عظمت کا یقین دلاسکوں، اور مجھے تلقین کر کہ میں ان کی سادہ لوحی کو گندم نما جو فروشی کی اعانت میں اپنے آرام کے لئے خاطر خواہ کام میں لاسکوں!!

اے جاہل ہندوستان کے سوشل مرتبہ کے خدا، ہردلعزیز بامروت خدا! مجھے ایسے ضروری اور موزوں معلوم ہونے والے غرور تکبر سے ملبّب کردے کہ میرا گستاخی آمیز پُرغرور برتاؤ، اہل قلم واہل دماغ کے ساتھ ناقابل برداشت ہونے کی حد تک پہونچ جائے، مگر ساتھ ہی مجھ میں وہ چمکیلا، اطاعت سے بھرا ہوا، اخلاق بھی قائم رکھ جس کی بدولت میں حکام بالادست کی نگاہ میں چاپلوسی کرنے والے چپراسی اور خوشامدی ٹٹو سے زیادہ نہ جچوں! اور قسم ہے تجھ کو اپنے مہذب اور خاموش پالیسی کی، موجودہ دورنگی ڈپلومیسی کی، مجھے ایسی قابلیت عنایت کر کہ میں التفات آمیز سرپرستی اور ہمدردی بھری ہوئی امداد کے رنگ میں اپنے رائے دہندگان کے سر پر شفقت اور مہربانی کا ہاتھ پھرا تا رہوں!!

اے جاہلوں کے مربی، چھوٹی سی شان والے نکتہ نواز! اپنی شان رحیمی کے طفیل میں ایسے روزِ بد سے، ایسی منحوس گھڑی سے بچا، کہ مجھے کونسل کے سامنے بولنے کی ضرورت پڑے! اے سب کچھ جاننے والے تو جانتا ہے کہ میں کوئی لکچرار یا اسپیکر نہیں ہوں۔ اور بفرض محال اگر ہوتا، تو بھی میرے ناکارہ دماغ میں کوئی ایسا قابل غور خیال نہیں جس کے لئے مجھے صرف ایک واہیات سے واہیات فقرہ بھی بولنا پڑے! اے دوربین کی امداد سے اصلیت کی تہ تک کو دیکھ لینے والے، دانا و بینا! تو دیکھتا ہے کہ تمام سوشیل فائدوں کے لحاظ سے، تمام قومی حقوق کے خیال سے، میری ذاتی رائے اگر ہے تو یہی اور صرف یہ ہی۔ کہ مردہ دوزخ میں جائے

یا بہشت میں، مجھے اپنے نام کے ساتھ ایم۔ سی۔ لکھنے کا حق ہمیشہ ہمیشہ تک حاصل رہے!

اے پارلیمنٹ اور کونسل کا حساب جانچنے والے، اور ایک ایک رائے کو شمار کرنے والے احکم الحاکمین! تو ضرور جانتا ہوگا کہ میں نے، تیرے بہترین بندہ نے محض ایم۔ سی۔ لکھنے کا حق حاصل کرنے میں مبلغ دو ہزار روپے سکۂ رائج الوقت مناسب اوقات پر خرچ کیے ہیں، یعنی ان دو حروف تہجی کو، ایم اور سی۔ کو بشرح ایک ہزار روپیہ فی حرف مول لیا ہے۔ اور اب میں ان کو، محض ان کو، تمام سوسائٹی، تمام قوم، اور تمام ملک، سے زیادہ عزیز، بلکہ اپنی جان سے زیادہ عزیز، رکھتا ہوں! اے مبلغ علیہ السلام کو ستار عیوب کا سچا مرتبہ عطا فرمانے والے کروڑپتی! ان دو حرفوں کو اس قدر گراں مول لینے کے بعد اگر میں یہ التجا کروں کہ مجھے کبھی کسی ضروری سے ضروری معاملہ میں بھی، کسی ایسے معاملہ میں بھی جس سے میری قوم کا فائدہ ہی وابستہ کیوں نہ ہوں مجھے ایک لفظ بھی بولنے کی ضرورت نہ پڑے، ہونٹ ہلانے تک کی حاجت نہ ہو۔ تو کیا بیجا ہوگی؟ نہیں نہیں، تو ضرور میری التجا پر غور کرے گا۔ غور کرے گا اور منظور فرمائے گا!

اے کونسل کے معاملات پر قدرت رکھنے والے چھوٹے سے بالشتی قادر مطلق! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس کمبخت جرنلسٹ اور پریس رپورٹر کو اپنی تحریر اور تقریر کی اصلاح وغیرہ کے معاوضہ میں بہت کچھ دیتا ہوں اور ساتھ ہی اس کی علمی قابلیت اور وسیع معلومات پر مجھے پورا بھروسہ بھی ہے، لیکن میں پھر بھی اس کی رٹوائی ہوئی اسپیچ پڑھتے ڈرتا ہوں۔ اور محض اس خیال سے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہسکی سوڈا، کہ معمول سے زیادہ چڑھا جانے سے وہ کچھ کا کچھ نہ لکھ گیا ہو! کیوں کہ اس کے الفاظ کچھ ایسے مشکل، اور اس کی عبارت کچھ ایسی پیچیدہ ہوتی ہے کہ مطلب سمجھنا تو درکنار میں اس کو بغیر پوری محنت کے صحیح صحیح طوطے کی طرح دوہرا بھی نہیں سکتا

اے حرف حرف پر پکڑتے اور نکتہ نکتہ پر چھوڑ دینے والے، ذی اختیار نکتہ نواز! کیا اچھا ہو کہ میں تیرے سایۂ عاطفت میں رہ کر اس خوفناک شخص سے چھوٹ جاؤں، اور کم از کم مجھ میں اسی قدر دماغ اور جرأت پیدا ہو جائے کہ میں مرحوم لائق، سر برآور دہ حضرات کی یاد سے اتر جانے والی

تقریروں اور تحریروں کے وہ حصّے جو میرے لئے مناسب اور موزوں ہوں رٹ لیا کروں، اور بغیر جھجکے وقت ضرورت سنا دیا کروں۔ اس میں سب سے زیادہ اطمینان بخش یہ بات ہے کہ مردہ حضرات اس خیانت کا، اس پوچ اور کمینہ پن کی چوری کا دعویٰ کرنے کیلئے قبر سے اُٹھکر نہیں آ سکتے، اور تو جانتا ہے کہ آج کل ایسی چوری، تحریر و تقریر کی چوری، شاعر، ناول نگار، لکچرار، نقاد، غرض سب کے سب اطمینان کے ساتھ کر رہے ہیں! بس تو، قسم ہے تجھ کو اپنی پولٹیکل اور اپنی ڈپلومیسی آمیز شان کی، مجھے بھی اس قابل کر دے کہ میں اپنی ضرورتوں کے موافق اکثر حصے گمنامی میں پڑی ہوئی تصنیفات سے چھانٹ سکوں۔ اور بغیر حوالہ دئے، بغیر یہ ظاہر کئے کہ وہ کسی اور دماغ کا نتیجہ ہیں، نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ کونسل کے روبرو پڑھ سکوں۔ یہ تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ زیادہ تر مجھ سے ہی ٹھوٹ اور ہیچدان حضرات سے بھری ہوئی ہے۔ وہ خود ایسے ہی خاموش بیٹھے رہتے ہیں جیسے کہ میں، اور اگر شاذ و نادر کوئی ایک سمجھنے اور بولنے والا آ بھی جاتا ہے تو ہم احمقوں کی تعداد کی زیادتی اس کی کچھ پیش نہیں چلنے دیتی۔ اور وہ اپنی تمام علمی لیاقت اور دماغی جدّت کے ساتھ بھی ہمارے کردہ حماقت و بے تمیزی کے مقابلہ میں کچھ ہستی نہیں رکھتا۔ اب رہے میرے رائے دہندہ، تو ان کی طرف سے مجھے یقین ہے۔ کہ وہ مویشی چرانے والے، کھیت کاٹنے والے گنوار، کسی طرح میرا ذریعۂ الہام، چالاکی سے بھرا ہوا اٹھائی گیرا پن، خود معلوم نہیں کر سکتے، اور ساتھ ہی لوکل اخبار کا اڈیٹر بھی ڈگری یافتہ نہیں جو میری اس چوری کو سمجھ سکے، اور پبلک کو سمجھا سکے، اس لئے سب سے زیادہ آسان، سب سے زیادہ اطمینان بخش، سب سے زیادہ سستا، کم خرچ بالا نشیں یہی طریقہ ہے کہ میں تحریر و تقریر کی چوری پر، دماغی قابلیت کے اُچکّے پن پر کمر باندھوں بشرطیکہ تو بھی مجھے اپنی مہربانی اور امداد سے، البتہ پوری ملی ہوئی امداد سے سرفراز فرماتا رہے!!

اے تمام دنیاوی اعزاز و مرتبہ عطا فرمانے والے قاضی الحاجات! اب مجھے ایسی

بلند اور اونچی شان، فریب، جھوٹ اور غرور سے بھری ہوئی شان عطا کر، جس کے بدولت میں سر سے پاؤں تک غیر معمولی قابلیت اور واجب التعظیم لیاقت کا پتلا نظر آنے لگوں۔ اور سوسائٹی کی ظاہر بین آنکھوں میں اپنے آپ کو وہ ثابت کر سکوں جو دراصل میں نہیں ہوں! اے ملک کی قسمت پر قدرت رکھنے والے، فرشتوں کی کمیٹی کے صدر نشیں! اپنی تمام انتظامی فراست کے صدقہ میں، میرے رائے دہندگان کو میری اصل وحقیقت کے دریافت کرنے کے معاملہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھا، بہرا اور گونگا کر دے، کیوں کہ ان کو میری ہیچدانی اور جہالت کی ذرّہ برابر بھی خبر ہوئی اور یقین آ گیا، تو میں آئندہ الیکشن میں ضرور اپنی عزت کھو بیٹھوں گا۔ اور پھر اپنے آپ کو ایم۔ سی۔ کبھی نہیں لکھ سکوں گا۔ جس کو میں اپنے نام کے ساتھ نتھی رکھنے کا دلدادہ ہوں۔ جس طرح ایک پولیس کا تھانیدار اپنی وردی پر تھانیداری کے چمکتے ہوئے مارک کا!!

اور تو اور، میری بیوی، تعلیم یافتہ ترقی یافتہ بیوی جس کا خوش رکھنا میری ہستی کا سب سے بڑا مقصد اور میری زندگی کا اکیلا فرض ہے، اس ناقابل برداشت صدمہ کی وجہ سے غصّہ کے مارے بے آپے ہو جائیگی۔ اور تو جانتا ہے کہ اس کا غصّہ تقسیم بنگالہ سے زیادہ مستحکم اور دیرپا غصّہ ایسی چیز ہے جو نہ خوشامد سے دبے اور نہ بندر بھبکیوں سے کم ہو۔ کیوں کہ زمانہ کی ہوا نے اُسے آزاد حاکم اور مجھے عاجز محکوم بنا دیا ہے۔ اس لئے اے حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے ناپید کنار سمندر کے بااختیار بیچوں! مجھے اس منحوس گھڑی سے بچا، جبکہ میں ایم۔ سی لکھنے کا حق کھو بیٹھنے کی وجہ سے اپنی سرو قد بیوی کے کبھی نہ فرو ہونے والے غصّہ اور نفرت کا شکار بنجاؤں!

اس سب کے علاوہ تو یہ بھی جانتا ہے، اور خوب جانتا ہے۔ کہ میں ترا تابع فرمان بندہ، کبھی کسی معاملہ میں اپنے ملک کی، اپنی قوم کی، اپنے مذہب کی بہتری کا طالب نہیں ہوں! ان تمام باتوں کی مجھے اتنی بھی پروا نہیں جتنی اڈّہ پر سفیدی، اور اسی وجہ سے ترک اٹلی کے جھگڑے میں یا روس وایران کے معاملہ میں کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار، میں ایک

فعل عبث سمجھتا ہوں! مارا چہ ازیں قصہ گاؤ آمد و خر رفت، میری طرف سے تمام دنیا جنت میں جائے یا جہنم میں مجھے اپنی چمکیلی شان و شوکت سے، اپنی سرو قد حکمران بیوی کی خوشنودی سے، اور اپنے نام کے ساتھ ایم۔ بی۔ لکھ لینے سے کام ہے، اور بس! اے لکشمی جی کے تیر نظر کے گھائل، اے مبلغ علیہ السلام کی جھنکار پر جان دینے والے کفایت شعار رزاق! ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مجھے کونسل کا ممبر رہنے کا فخر عنایت کر، اور ابدالآباد تک مجھے اپنی شان اللہ نوازی کا مرجع قرار دے، آمین!! ثم آمین۔

غزل

(جناب قدرت علی صاحب عزت)

اس تجاہل سے مدعا کیا ہے
تیری یہ ہر گھڑی کی "کیا" کیا ہے

اب وہ بیتابیاں نہیں مجھ میں
جانے آنکھوں سے بہ گیا کیا ہے

درد دل ہو گیا دوا آخر
ہم نہیں جانتے دوا کیا ہے

بیقراری یہ کیوں ہے حضرت دل
کچھ تو فرمایئے ہوا کیا ہے

ہو نہ بوئے ریا تو پھر زاہد
فرش قالین و بوریا کیا ہے

بیخبر ہیں کسے خبر اتنی
ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے

سچ تو یہ ہے مریض عشق کبھی
جانتا ہی نہیں شفا کیا ہے

سُن تو لیجے کلام عزت کا
"مانا اچھا نہیں"۔ بُرا کیا ہے

معارف

(از مولانا وحید الدین صاحب، سلیم پروفیسر عثمانیہ کالج، حیدرآباد دکن)

کانپ اے دل! نہ محبت میں تمناؤں سے — ہے گزرنا تجھے ان خون کے دریاؤں سے

تارے دیتے نہیں، کچھ منزلِ مقصد کا پتہ — پار جاتا ہوں میں ان حسن کی دنیاؤں سے

حسن نے کردیے پھولوں سے گلستاں پیدا — عشق نے ذروں کو ٹکرا دیا صحراؤں سے

ایکدن عیش پسندی سے یہ محنت نے کہا — میں غلاموں کو بڑھا دیتی ہوں آقاؤں سے

دل کی آنکھوں نے بھی دیکھا نہیں جن جلووں کو — اب بغلگیر ہیں وہ میری، تمناؤں سے

پہلے تفتیش دلوں کی ہوئی، اب روحوں کی — کوئی گوشہ نہ بچیگا، ترے جویاؤں سے

بینشیں دیکھ کے ہر جلووں سے تحیّر میں ہیں غرق — دانشیں دنگ ہیں قدرت کے معمّاؤں سے

اپنی نادانی کا اقرار بھی دانائی ہے — بس یہی بات چھپی رہ گئی داناؤں سے

مردہ دل جنکو سمجھتے ہو، یہ وہ مردے ہیں — زندہ ہوتے نہیں دیکھے، جو مسیحاؤں سے

مغنیۂ فطرت

(از رشید صدیقی)

چھیڑ دے، او مغنیہ! نغمۂ زندگی کوئی
کھینچ دلِ فسردہ پر، نقشۂ زندگی کوئی

پھونک دے! روحِ بیخودی، چھیڑ دے نغمۂ حیات
گردشِ چشم پر تری رقص کناں ہے کائنات

کیف ہے سب زمانہ کا، تیری صدائے ساز میں
آہ، بلا کا سوز ہے تیری نوائے راز میں

چھیڑ دے اب کوئی راگنی، سازِ جہاں خموش ہے!
انجم و مہ خموش ہیں! کون و مکاں خموش ہے!

دامنِ ناز میں ترے کھیل رہی ہیں شوخیاں
تیرے ہر اک اشارہ میں کوندرہی ہیں بجلیاں

برشِ تیغ سے تری سینۂ غم فگار ہے!
تیری ادا کا بانکپن، صفحۂ زرنگار ہے

بھر دیں نسیمِ صبح میں شوخیاں تونے کوٹ کر
نکہتِ گل ہے بیقرار، دامنِ گل سے چھوٹ کر

غنچۂ ناشگفتہ میں پہلے تو رنگ بھر دیا
پھر جو ہنسا کے گُل کیا، باغ میں طاق کردیا

آیا بہار پر شبابِ حسن ہے اب چمن چمن
نغمہ و ساز سے ترے گونج رہی ہے انجمن

مقالات

شاعر اور نغمہ

(از نسیم فردوسی)

آجکل حلقۂ شعرا مین اشعار کو عموماً گا کر پڑھنے کا رواج ہو گیا ہے۔ اور اس دستور نے کچھ ایسی شہرت حاصل کر لی ہے کہ "شاعر" کا نام آتے ہی دماغ "موسیقی" کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ مشاعرون پر جنھین درحقیقت زبان۔ تخیل اور جذبات کا ٹکسال کہنا چاہیئے عام طور پر "محفل سماع" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مشاعرون کی وہ کثرت اور بہات اب باقی نہین رہی۔ اور اگر کسیقدر ہے بھی تو اسے وہ اہمیت نہین دیجاتی۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ شعر کو نغمہ سے وہی تعلق ہے جو روح کو جسم سے۔ روح کی غذا راگ ہے۔ لیکن اس غذا کے مہیا کرنے کا سامان شعر ہے۔ یا یون کہئے کہ شعر کا زیور نغمہ ہے۔ بغیر نغمہ کے شعر سونا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نغمہ کی جان شعر ہے۔ اگر شعر نہ ہو تو نغمہ کوئی چیز نہین۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کو نغمہ سے کیا تعلق ہے۔ اور دونون کس حد تک ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہین۔

اگر یہ صحیح ہے کہ شعر اور نغمہ دونون ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہین۔ تو یقیناً شاعر کو ان کی درمیانی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب کبھی شعر "سادگی" سے پڑھا جائیگا تو "نغمہ" کی کمی ضرور محسوس ہو گی۔ اور اگر نغمہ کے ساتھ پڑھا جائے گا تو گویا اپنے تمام ضروری اجزا سے ملکر مکمل ہو جائے گا۔ اور اس کا حُسن دوبالا نظر آئے گا۔ اس حیثیت سے شعر کو اُس کی بہترین صورت مین پیش کرنے کے لئے شاعر کا مغنی ہونا لازمی ٹھہرتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہین کہ اگلے وقتون کے شعرا مین کثرت ایسے ہی لوگون کی تھی جو نغمہ و ترنم سے بے نیاز ہو کر اشعار سُنایا کرتے تھے۔ اور اگر دیکھا جائے تو آج بھی ایسے لوگون کی کمی نہین ہے

مقالات

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس زمانہ کے شعرا کے دماغون پر "موسیقیت" کا اثر کیون ہوتا جاتا ہے۔

بظاہر اسکے دو اسباب معلوم ہوتے ہین (۱) لیاقت واستعداد شاعری کی کمی۔ (۲) اگلے مذاق کا فقدان :۔ ان دو وجوہ میں سے اول الذکر تو شاید کسی تشریح کا محتاج نہین۔ ملک مین شاعرون کی کچھ ایسی کثرت ہوگئی ہے کہ آپ ہر کس وناکس کی زبان سے یہ فقرہ سُن لیجئے "اس زمانہ مین تو برساتی مینڈکون کی طرح شاعر پیدا ہوتے ہین۔" اگر مین برسرِ غلط نہین ہون تو وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ شاید ہی کوئی ایسا تعلیمیافتہ گھرانہ ہوگا جس مین کم ازکم ایک شاعر نہ ہو۔ جب یہ عالم ہے تو آپ کو کہان تک ایسے شاعر ملین گے جن کے کلام مین آپ ایجاد معانی اور اختراع خیالی کی تلاش کرین۔ یہان تو یہ حالت ہے کہ بہتیرے نام نہاد شعرا ایسے ہین جو محض ردیف وقافیہ کی "تک بندی" بھی صحیح نہین کرسکتے۔ پھر حُسن زبان وبیان تو ایک بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن چونکہ شاعر بننے اور کہلانے کا شوق غالب ہے اس لئے "بزعم شاعر" مشاعرون مین شریک ہونے کے لئے ہمہ تن طیار نظر آتے ہین۔ اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ مجلس مشاعرہ مین جہان ایسے ویسے شاعر ہوتے ہین وہان بڑے بڑے نقادِ فن بھی ہوتے ہین۔ چنانچہ یہ "خانہ ساز شعرا" عیوب برہنگی چُھپانے کے لئے نغمہ کی اوٹ ڈھونڈھنے پر مجبور ہوتے ہین۔ اور اس طرح نغمہ سرائی کی بدولت یہ لوگ اشعار مین ثقاہت لفظی اور وزن وغیرہ کی معمولی غلطیان بنھالے جانے کی کوشش کرتے ہین۔ یہ تو ان شعرائے کرام کا ذکر ہے جن مین لیاقت واستعداد شاعری مفقود ہے۔ اور چونکہ ایسے شعرا کی تعداد دن بدن ترقی پذیر ہے اس لئے اشعار کو گا کر پڑھنے کا رواج بھی بڑھتا جارہا ہے۔

دوسرا سبب اس "نغمہ سنجی" کا جیساکہ اوپر بیان کیا جاچکا اگلے مذاق کا فقدان

مقالات

ہے۔ پہلے زمانہ مین ایک خاص جماعت ان شعرا کی ہوا کرتی تھی جو مشاعرون مین پڑھتے وقت شعر کا مفہوم اپنی ترنم ریزی۔ حرکات اور سکنات سے بھی ادا کردیا کرتے تھے۔ گویا وہ زبان اور عمل دونون طریقون سے شاعری کا حق ادا کرتے تھے۔ ایسے شعرا مین تحتی پڑھنے والے نمایان خصوصیت رکھتے تھے۔ اور اس صف مین جان صاحب سب سے آگے نظر آتے ہین۔ لیکن موجودہ دور مین ایسی ہستیان کہین نہین دکھائی دیتین۔ اور حقیقت تو یہ ہے ان لوگون کی نقل اتارنا کوئی آسان بات نہین ہے۔ لیکن تاہم اسوقت بھی ایسے لوگ موجود ہین جو شعر پڑھتے وقت اعضا کی جنبش اور اشارون کا استعمال کرتے ہین۔ شاید یہ لوگ ان تحتی پڑھنے والون کا چربہ ہی اتارنے کی کوشش مین یہ حرکتین کرتے ہین۔ اور بہت ممکن ہے کہ انھین کی دیکھا دیکھی نغمہ سرائی کا بھی رواج پڑ گیا ہو۔ بہر حال گمان غالب یہی ہے کہ انھین دو وجوہ کی بنا پر شعرا مین نغمہ کا دستور ہوا۔ لیکن اسکی کوئی صحیح تاریخ نہین پیش کی جاسکتی کہ اسکی ابتدا کب اور کہان ہوئی۔

ایک تیسرا اگر میرے خیال مین غیر معقول سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغربی تہذیب نے شعرا کی ذہنیت کو موسیقی کی طرف مائل کردیا ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ شعر کا زیور نغمہ ہے۔ لیکن وہ نغمہ نہین جو عیوب کو چھپانے کا ذریعہ بنایا جائے۔

ماسٹر:۔ (نقشہ کی طرف اشارہ کرکے) احمد بتاؤ نقشے میں پانی کہانتک ہے؟

احمد:۔ (غور سے دیکھکر) اگر نقشہ میں پانی ہوتا تو بھیگ نہ جاتا۔

انتخابات

نغمۂ الوہیت

میں تیرے دروازہ پر آؤں، اور یوں ہی خستہ وخراب، ایسے ہی افسردہ و مضمحل واپس چلی جاؤں! اے بادشاہ! میرے ہاتھ خالی تھے، اور ضرورت شدید، مگر تو نے مجھ پر رحم نہیں کیا۔ شام ہونے سے پہلے، شہر کے سارے مفلس و نادار سائل، دور کے تمام تھکے ہارے مسافر آئے، تو اپنی شاہانہ عظمت کے ساتھ، اپنے احترام و وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچانک ان لوگوں کے درمیان آگیا، میں نے دیکھا، اے آقا تیرے ہی تبسم کی ضیا میں، تیری ہی مسکراہٹ کی روشنی میں، تو نے اُنھیں کچھ مرحمت کیا، اور وہ خوش خوش چلے گئے، لیکن میں ویسے ہی محتاج، ویسی ہی گدا کھڑی رہی، اور تیری نظر میری طرف سے پھر گئی،

دوسرا دن گذر جانے کے بعد، میں اُن لوگوں کے ساتھ پھر آئی، جو گذرگاہوں اور سڑکوں پر، جو گلیوں اور کوچوں میں، مانگتے ہوئے تیرے دروازے کی طرف آرہے تھے۔ تو نے مجھے دیکھا اور کچھ نہیں بولا، میں نے سمجھا آج میری آرزو پوری ہوگئی، اس لئے کہ میرے پاس کچھ نہ تھا، اور میری احتیاج کثیر، تھوڑی دیر کے بعد تو اپنے آراستہ ملبوس، اپنے مزین تاج کے ساتھ نکلا، اور اُن کو کچھ لطف کیا، میں نے بھی مضطربانہ اپنا ہاتھ بڑھادیا، کہ شاید، وہ چشمہ جس نے ملکوں کو سیراب کردیا، وہ سمندر جس نے کائنات کو مستغنی بنادیا، میرا دامن بھی تر کردے۔ مگر تو نے نگاہیں پھیرلیں، اور میں ویسے ہی بے یار، ویسے ہی بے کس رہ گئی، شہر کے حاجت مند، فخر و غرور سے مجھے دیکھتے ہوئے، اور میری ناسازگاری بخت کا طعنہ دیتے ہوئے" میرے پاس سے گذر گئے، میں ہنوز خاموش تھی کہ تو نے مجھے دیکھا، میں نے کہا ایک درماندہ عاجز، ایک تنگ دست و بے نوا، ایک غریب و بھکاری لڑکی کے

انتخابات

لہٰذا نغمہ یہ سلوک، اے تو دولتمند! یہ سُنکر تو نے ایک نغمۂ اُلوہیت گایا اور گاتا رہا،
حتیٰ کہ میرا قلب تیری دولت سے مالا مال، اور میرا دل تیری مسرت سے معمور ہوگیا:
مجھے کیا خبر تھی! اے مالک! کہ "تو یہ چاہتا ہے"

افکار عالیہ

(مولانا احمر ترمذی)

اب تو جنوں نے اور بھی زنجیر دیکھ لی
اک یہ تھی چارہ ساز کی تدبیر دیکھ لی

پنہاں ہے اس سکوت میں وہ داستانِ غم
روئیگی خلق گر مری تصویر دیکھ لی

دیکھیں گی اور کیا مری ناکام حسرتیں
اِک دیکھنے کی چیز تھی تقدیر دیکھ لی

تو اور خیالِ صحبتِ بزمِ نشاط خیز
اے غم نصیب! خواب کی تعبیر دیکھ لی

کھلتے ہیں اشکِ خوں سے کہیں عقدہ ہائے دل
تیر ہی بھی انتہا خلشِ تیر دیکھ لی

اب دیکھا فریب خیالِ طلسم ساز
مٹی ہے روز بنکے جو تعمیر دیکھ لی

محویتِ خیال کی یہہ شوخیٔ نظر
اُس حسنِ صد حجاب کی تنویر دیکھ لی

آہوں سے چھا گیا ہے دُھواں ساری بزم میں
احمر مِرے کلام کی تاثیر دیکھ لی!

نسائیات

مضمون نگار خواتین

(از ریحانہ خاتون عباسی)

اندنوں ملک کے مختلف پرچوں اور رسالوں میں مضمون نگار خواتین کے متعلق مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اس قسم کے اکثر مضامین کا موضوع یہی ہے کہ آجکل کی خواتین شاعری اور فسانہ نگاری کے ذریعہ انتہائی بے غیرتی، بے باکی، اور حیا فروشی کا ثبوت دے رہی ہیں چنانچہ بعض مضامین میں تو ایسی خواتین کے تخیلات اور جذبات پر حد سے زیادہ تجاوز کر کے غیض و غضب کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ان کے افکار و حسیات کو مکدر بتایا گیا ہے۔

بعض مضامین نگاروں نے یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ ان خواتین کے قابل نفرت اور ناشائستہ مضامین نظم و نثر سے مثال کے طور پر اقتباسات پیش کئے ہیں۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ان کو پڑھکر انسانی حمیت و غیرت کو صدمہ پہنچتا ہے۔

سب سے پہلی بات جو ان واقعات کو دیکھ کر صاحب قلم بہنوں کے دماغ میں پیدا ہونی چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کا ہر پہلو اور ان کی قلم کی ہر جنبش جنس مخالف کی دنیا میں تمسخرانہ اور تنقیدی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اور اس لئے انھیں اپنی دماغی اور دلی کیفیات کو تحریری جامہ پہنانے میں انتہائی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

مضامین کے قابل اعتراض ہونے یا نہونے کا فیصلہ وہ خود کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے اشعار و افسانے جو حقیقت میں بازاری باتوں کے دفتر ہوں مردوں کی قلم سے بھی قابل نفرت خیال کئے جاتے ہیں۔ پھر خواتین کے لئے جنھوں نے ابھی کل سے شدبد شروع کی ہے ایسی باتیں کب زیبا ہیں؟۔

دنیا سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ اقوام عالم میں زبردست انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ترقی و تنزل دنیا کا خاصہ ہے۔ بیشک ہم پستی کے عالم میں ہیں

اور ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دفعتاً کود کر اس بام ارتقا پر پہونچ جائیں جس کے بعد اقوام کا تنزل شروع ہوتا ہے۔

کوشش کا سلسلہ جاری ہے۔ خواتین کی طرف خاص توجہ ہے۔ اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستانی خواتین بھی "مشرقی تمدن" کی زندہ کرنے والی اور "اپنی کھوئی ہوئی عظمت" کو واپس لینے والی کہلائیں گی۔ مگر اس کے لئے سعی پیہم اور استقلال چاہئے۔ نہ یہ کہ ترقی کی دھن میں ہم آنکھیں بند کرکے شرم وحیا اور دین وایمان بھی صدقہ کر بیٹھیں۔

میں تو اپنی مقتدر بہنوں کو یہی مشورہ دونگی کہ ابھی وہ اپنی شاعری اور مضمون نگاری صرف خواتین کی ترقی و بہبود کے لئے وقف کر دیں اور جو کچھ کہیں اور لکھیں وہ محض اسی کے متعلق ہو۔

لطائف

ایک معلم نے شاگرد کو ہدایت کی کہ گفتگو بفصاحت و بلاغت کرنا چاہئے۔ طالبعلموں نے تائید کی۔ ایک روز چلم کی چنگاری معلم صاحب کی پگڑی پر جا پڑی۔ شاگرد نے اطلاع کی۔ "جناب استاد صاحب مولانا ومقتدانا قبلہ وکعبہ ام حضور کی دستارِ عظمت آثار پر ایک اخگر ناہنجار شرربار آتشکدۂ چلم سے پرواز کرکے شعلہ افگن ہے۔"

اس عرصہ میں معلم صاحب کی نصف پگڑی جل گئی۔ معلم صاحب فرمانے لگے "خود کردہ را علاجے نیست۔"

کسی جنرل نے بعد فتح کرنے مہم کے ایک سپاہی سے پوچھا کہ تونے اس فتح میں کیا بہادری کی۔ اس نے جواب دیا کہ میں ایک حریف سپاہی کا پانوں کاٹ ڈالا۔ جنرل نے کہا کہ پانوں کیوں کاٹ ڈالا اس سے کیا حاصل ہوا۔ سر کیوں نہ کاٹ ڈالا۔ سپاہی بے تحاشا بول اٹھا کہ حضور سر تو پہلے ہی سے کٹا ہوا تھا۔

نسائیات

جہیز میں کیا دو؟

(از ع۔ ص۔ بنارس)

اس پرآشوب زمانہ میں جبکہ ہر طرف گرانی کا بازار گرم ہے۔ عموماً ہر جہیز دینے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کونسی ایسی چیز پیش کرے جو کم خرچ بالانشیں کی مصداق ہو۔

اول تو ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں میں جہیز کی قدیم رسم نہایت بے مصرف ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جہیز پانے والی کو تھوڑا بہت اثاثہ ہاتھ لگ جاتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات وہ بجائے فائدہ بخش اور کارآمد ہونے کے وبال جان ثابت ہوتا ہے۔ پلنگ، مسہری، صندوق، اور اسی قسم کی دوسری اشیاء ایسی چیزیں ہیں جو تقریباً ہر گھر میں کافی موجود ہوتی ہیں اور اگر بفرض محال نہ بھی ہوں تو ان کا مہیا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ پھر ایسی چیزیں لیکر سوائے اس کے کہ ان کی صفائی اور نگرانی کی ایک بلا ضرورت شکل کا اور اضافہ کر لیا جائے اور کوئی فائدہ نہیں۔

اس لئے جہیز دینے کے لئے سب سے عمدہ طریقہ تو یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو یہ معلوم کر لیا جائے کہ جہیز پانے والی کے یہاں ضروریات زندگی کی چیزوں میں کس چیز کی کمی ہے اور پھر وہی چیزیں دیجائیں۔ اس سے دینے اور پانیوالے دونوں فریق کو مسرت اور اطمینان حاصل ہوگا۔ دینے والے کو یہ خوشی ہوگی کہ اسباب جہیز میں اس نے جو کچھ خرچ کیا ہے وہ بیکار نہیں گیا۔ بلکہ پانے والی کی آرام رسانی میں صرف ہوا ہے۔ دوسری طرف پانیوالی کو یہ اطمینان ہوگا کہ بلاکسی ردوکد کے اسے اسکی ضرورت کی چیزیں میسر آگئیں۔

لیکن اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو اپنے ہی قیاس کی بناء پر ایسی چیزیں دیجائیں جنکی عام طور پر ہر گھر میں ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جہیز پانے والی کے مذاق سے بخوبی واقفیت ہے تو اس کے لئے وہی چیزیں زیادہ موزوں ہونگی جو اسے مطلوب ہوں۔ خواتین کی عام حالت کو دیکھتے ہوئے تو اسکی امید بہت کم ہوتی ہے۔ تاہم اگر جہیز پانے والی تعلیم یافتہ ہے تو اس کے لئے مختلف کارآمد علوم و فنون کی کتابیں اور اسی قسم کی دوسری

بیش بہا چیزیں زیادہ قابل قبول ہونگی۔

اسی سلسلہ میں اصل موضوع سے ذرا ہٹکر اگر لڑکیوں کی تعلیمی حالت پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرتاً لڑکیاں والدین کے گھر سے جس جہیز کے حاصل کرنے کی مشتاق اور مستحق ہوتی ہیں وہ تعلیم جیسی بے بہا دولت ہے۔ لیکن یہاں اسی کا ماتم ہے۔ جب کہیں شادی کا تذکرہ چھڑتا ہے تو اور باتوں کے ساتھ سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ "لڑکی تعلیم یافتہ ہے؟" معلوم نہیں وہ زمانہ کب آئیگا جب اس استفسار کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

الغرض جہیز کے لئے۔ علم، خانہ داری، دستکاری اور مفید پند و نصائح کے قسم کی لطیف مگر ہمیشہ ساتھ دینے اور کام آنے والی چیزیں سب سے بہتر ہیں۔

دنیائے ادب میں "ادبستان" اردو کا

سنہ ۲۶ - خیر مقدم - ۱۹ عیسوی

(از جناب ماؔئی اجمیری)

گلشن ہستی میں ہے اقدام مہمانِ ادب
نغمہ پیرا چار سو ہیں عندلیبانِ ادب

قمری سیمیں بدن اور طوطی شیریں دہن
زمزمہ سنجان گلشن ہیں غزلخوانِ ادب

چہچہے یہ کس لئے، یہ زمزمہ ریزی ہے کیوں
کون ایسا گلبدن آیا ہے مہمانِ ادب

ہوگیا آخر یقین، وہ شان والا دلربا
ہے ادیب خوشنوا ہے زیب عنوانِ ادب

آج ہی کا حسن وقف جلوہ آرائی ہوا
ہوگئے گھر گھر میں پیدا ساز و سامانِ ادب

بیگماں آئیگا اسکو وجد "ادبستان" پر
دل میں ماؔئی جس کے جا بیٹھا ہے پیکانِ ادب

مقالات

اسلام اور ملوکیت

(از راجہ غلام حیدر خان صاحب)

ہندوستان کے اسلامی حلقون مین عام خیال یہی ہے کہ موتمر مکہ جس کے حالات آجکل اسلامی اور غیر اسلامی اخبارات مین شایع ہورہے ہین دنیا کی سب سے پہلی موتمر ہے جو تیرہ صدی کے بعد مکہ معظمہ مین سلطان ابن سعود کی دعوت پر منعقد ہوئی۔ لیکن میرے خیال مین یہ دوسری موتمر اسلامی ہے۔ دس سال ہوئے کہ "مدینہ کا نفرنس" کے نام سے اردو کی ایک کتاب جسکی ضخامت غالباً دو سو سے زیادہ صفحے تھی۔ اور جسے لاہور کے ایک مسلمان تاجر کتب نے شائع کیا تھا میری نظر سے گذری۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ آج سے اندازاً تین سو سال پہلے مدینہ مین دنیائے اسلام کے مقتدر علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کا بجز اس کے اور کوئی مقصد نہ تھا کہ نہ صرف اسلام کے زوال و انحطاط کے اسباب پر غور کیا جائے۔ بلکہ جو تجاویز دین قیمہ کے استحکام اور فرزندان توحید کی فلاح و بہبود کے لئے منظور کی جائین ان پر عمل کیا جائے۔

اس کتاب کے جس باب کو مین نے خاص دلچسپی سے پڑھا وہ مسلم فرمانرواؤں کے غیر محدود اختیارات کے متعلق تھا۔ تاریخ ہمین اس المناک اور جگردوز حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ دنیا مین بادشاہون کی مطلق العنانی اور خودمختاری ایسے خوفناک ہنگامون، فتنون اور خونریزیون کا سرچشمہ رہی ہے کہ ان کے تصور سے شاید ابلیس بھی کانپ اُٹھے۔ اگر اس مطلق العنانی اور خودمختاری کی داستان قلمبند کی جائے تو بلا مبالغہ اس سے سینکڑون ضخیم جلدین تیار ہوسکتی ہین۔ ایسی ملوکیت بنی نوع انسان کے لئے ایک لعنت ثابت ہوئی ہے۔ کسی ملک یا قوم کی اس سے زیادہ سیاہ بختی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ملوکیت کے استبداد کی تختۂ مشق

مقالات

بتائی جائے۔ خالق ذوالجلال نے دنیا مین پیغمبر اسی لئے بھیجے کہ وہ خدا کی مخلوق کو ظالمون کے ظلم سے بچائین اور انھین صراط مستقیم دکھائین تاکہ وہ اپنے خالق کو پہچانین اسکے احکام پر چلین اور سوائے اس کی ذات کے اور کسی طاقت کے سامنے اپنی گردن نہ جھکائین۔

حضور سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی پیغام لے کر آئے۔ آپنے دنیا کے بڑے بڑے گردن افرازون تک اپنی یہ آواز پہنچائی کہ پرستش کی سزاوار صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ جس کا کوئی شریک نہین۔ اور انسانون مین صرف وہی لوگ اعلیٰ اور افضل ہین جن کے اعمال اچھے ہین۔ جب تک مسلمان اس مبارک تعلیم پر عامل رہے وہ باوجود قلیل التعداد ہونے کے اپنے دشمنون پر غالب رہے اور ایک صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھاگئے۔ یہ بارگاہِ خداوندی سے مسلمانون کو وہ انعام ملا جس کا ان سے وعدہ کیا تھا کہ تمہین زمین پر اپنا خلیفہ بنائین گے۔ صدیق اکبر کی خلافت کے بعد فاروق اعظم کی حکومت ملوکیت نہین بلکہ وہ حقیقی جمہوریت تھی جس کی بنا دنیا کے مصلح اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے مبارک ہاتھون سے ڈالی تھی۔ کیا دنیا کی کوئی موجودہ جمہوری سلطنت اس آزادی اور بیباکی کی مثال پیش کرسکتی ہے جو ایک عامی کو فاروق اعظم جیسے باجبروت خلیفہ کے دربار مین حاصل تھی؟ ہرگز نہین!۔ لیکن جب مسلمانون نے خداوند کریم کے اس سب سے بڑے عطیہ (جمہوریت) کی قدر نہ کرنے سے ناشکر گذاری کے جرم کا ارتکاب کیا تو وہ ملوکیت اور استبداد کی لعنت مین گرفتار ہوگئے۔ وہ اس کے آہنی پنجہ سے رہائی پانا چاہتے ہین وہ آزادی اور حریت کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت صرف کررہے ہین لیکن چونکہ انھون نے خدا کی رسّی کو دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا تھا اس لئے باوجود ہزار کوشش کے وہ ناکام اور نامراد نظر آتے ہین۔

ملوکیت اور استبداد کے بھی وہ خوفناک نتائج تھے جو مدینہ کانفرنس کے انعقاد کی وجہ تحریک تھے۔ مدینہ کانفرنس کی مطبوعہ روئداد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرزندانِ توحید

مقالات

کی پستی اور تنزلی کے جو اسباب اس وقت غور و فکر کے قابل معلوم ہوتے ہین وہی آج سے تین صدی پہلے دنیائے اسلام کے علما کی خاص توجہ کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مدینہ کانفرنس مین مسلمان فرمانرواؤن کی خودمختاری پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی گئی۔ افسوس ہے کہ میری قوت حافظہ کمزور ہے اور مین دس سال پہلے کے پڑھے ہوئے واقعات کو بجنسہ دُہرا نہین سکتا لیکن ملوکیت پر بحث کا یہ پہلو یقیناً ناظرین کرام کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ مدینہ کانفرنس کے تمام مقتدر علما نے بالاتفاق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اسلام کے بقا اور استقلال کے لئے یہ ضروری ہے کہ بادشاہ کو ہر امکانی طریقہ سے سمجھایا جائے کہ وہ رعایا کے حقوق کے متعلق اپنے فرائض اسلامی قوانین کے مطابق بجا لائے۔ اگر بادشاہ لہو و لعب مین پڑا ہوا ہے تو تفریحی مشاغل ہی کے دوران مین اس کی اصلاح کی جائے۔ غرضکہ بادشاہ کی اصلاح کے لئے وزرا امرا اور علما کی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اور اگر ان تمام کوششون اور تدبیرون کے باوجود بادشاہ راہ راست پر نہ آوے تو پھر سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہین کہ بادشاہ کی زندگی کا تلوار سے خاتمہ کر دیا جائے تاکہ جمہور کو ملوکیت اور اس کے ہولناک نتائج سے نجات ملے۔ یہ ہے مفہوم مذکورۂ بالا بحث کا۔

دنیا کے ادیان مین اسلام اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو حقیقی معنون مین انسان کی آزادی کا ضامن ہے۔ قرآن کریم مین فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس قدر سبق آموز اور عبرت انگیز ہے کہ اگر ہر مسلمان اپنی زندگی مین اس کی حقیقت کو پیش نظر رکھے تو کسی فرعون کی فرعونیت اس کے دل پر اثر نہین ڈال سکتی۔ کلام پاک مین اس قصہ کے مذکور سے یہی مقصود ہے کہ مسلمان سوائے اپنے خالق کے دنیا مین کسی شخصیت سے مرعوب نہ ہو خواہ وہ کیسی ہی بارعب اور پُرجلال ہو۔ اگر جابر اور ظالم بادشاہ

کی فرمانبرداری اور اطاعت ہرطرح سے جائز سمجھی جاتی تو خداوندکریم حضرت موسیٰ کو فرعون جیسے باجبروت اور طاقتور بادشاہ پر غالب نہ کرتا۔ حالانکہ دنیاوی پہلو سے حضرت موسیٰ کو فرعون سے وہی نسبت تھی جو رائی کو پہاڑ سے ہے۔ لیکن تمام دنیا جانتی ہے کہ فرعون آخر اپنی بداعمالیون اور ظالمانہ حرکتون کی پاداش مین جو دراصل خالق کی کمزور مخلوق کے دلون پر اپنی خدائی کا سکہ بٹھانا چاہتا تھا کس طرح دریائے نیل مین غرق ہوا اور اس کی خدائی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا فرعون اپنے اس اقتدار اور حکومت کو قائم رکھنا چاہتا تھا جو بنی اسرائیل کے لئے ایک لعنت تھی اور خدا نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے انھین اس لعنت سے نجات دی۔

لیکن باوجود اس بصیرت افروز واقعہ کے دنیا مین فرعونیت کا خاتمہ نہین ہوا تاریخ ہمین بتارہی ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم مین فرعون صفت ہستیان پیدا ہوئین جنھون نے طاقت اور حکومت کے نشہ مین فساد اور ظلم کا بیج بویا اور لوگون کو ان کے جائز اور پیدائشی حقوق سے محروم کیا۔ فساد اور ظلم کی سیاہ گھٹا سے چارون طرف تاریکی چھاگئی اور جب لوگون نے ظالم کے ظلم سے ڈر کر حق اور انصاف کی آواز بلند کرنے کے متعلق اپنے خالق کی ذات پر بھروسہ نہ کیا تو ان کی مصیبتین اور پریشانیان اور زیادہ بڑھ گئین۔ مسلمان اگر ان مصیبتون اور پریشانیون سے نجات پانا چاہتے ہین تو انھین حضرت موسیٰ کے نقش قدم پر چلنا پڑیگا۔ جن کے دل مین سوائے اللہ کے ڈر کے اور کوئی ڈر نہ تھا۔ جب قرآن کریم نے فرعون اور حضرت موسیٰ کے قصہ سے انسان کی ملوکیت کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کردیا ہے تو ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ ملوکیت کے ناپاک اثرات کے مٹانے کے لئے ہر وقت کمربستہ رہے۔ ایسی ملوکیت جو جبر واستبداد اور غیرمحدود اختیارات کا سرچشمہ ہے کسی صورت مین رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کی ممد ومعاون نہین ہوسکتی۔ اسلام صرف اسی قسم کی ملوکیت کو جائز قرار دیتا ہے جس کی بنیاد خدا کی وحدانیت خدا کے خوف۔ تقویٰ اور پرہیزگاری۔ عدل وانصاف۔ اخوت اور محبت۔ ہمدردی اور فیاضی

مقالات

نیکی اور سچائی پر مبنی ہو ۔ جو بادشاہ یا خلیفہ ان ربانی اصولون کا حامل اور عامل ہوگا وہ صحیح معنون مین اللہ کے رسول کا نائب ہوگا۔

آج مسلمانون کا شیرازہ دنیا کے ہر حصہ مین منتشر نظر آتا ہے ۔ وہ باوجود کثیر التعداد ہونے کے ہر جگہ دینی اور دنیاوی پہلو سے بحیثیت مجموعی پستی اور ذلت کے عمیق غار مین گرے ہوئے ہین وہ اس غار سے نکلنا چاہتے ہین مگر کوئی کوشش اب تک کارگر نہین ہوئی۔ تھوڑے سے غور وفکر کے بعد ہمین اپنی اس تباہی اور بربادی کی وجہ صاف معلوم ہو جائے گی اور وہ یہ ہے کہ ہم عملاً خدا کی وحدانیت اور اس کی حقیقت کے قائل نہین ۔ اگر ہم خدائے ذوالجلال کی ہستی کو اپنی اس فانی زندگی کا مرکز قرار دین۔ اور ہمیشہ اس نکتہ کو ملحوظ رکھین کہ ہماری نجات اسی کی رضا جوئی پر ہے تو ہم کبھی صراط مستقیم سے نہ بھٹکین ۔ لیکن جب ہر شخص اسلام کی جمہوریت کی عظمت برقرار رکھنے کے بجائے اپنے نفس کی خلافت قائم کرنے کی تدابیر مین منہمک رہیگا تو وہ گویا دیدہ و دانستہ خدا کی رسّی سے علیحدہ ہوگیا جس کے مضبوط تھامنے پر اس کی نجات کا انحصار تھا۔ بکھری ہوئی طاقتین صرف اسی صورت مین تحیر خیز اور انقلاب آفرین نتائج پیدا کرسکتی ہین کہ وہ ایک مرکز پر جمع ہون ۔ خدا کی وحدانیت پر عملاً ایمان لانا یہی ہے کہ فرزندان اسلام من حیث الجماعت اپنی تمام طاقتون کو خواہ وہ جسمانی ہون یا روحانی اخلاقی ہون یا دماغی صرف ایک مرکز سے وابستہ رکھین تاکہ وہ اسلام کی دینی اور دنیاوی برکتون سے مستفید ہون۔ اسلام کی مرکزی طاقت ایک ایسا پور ہاؤس (بجلی گھر) ہے جس کے عظیم الشان نتائج ایک معمولی انسان کے فہم وادراک سے بالاتر ہین۔ مسلمانون نے دنیا مین جہان کہین اس پور ہاؤس سے کام لیا وہان اُجالا ہوگیا۔ اور وہ قومین جو تاریکی اور ضلالت مین بھٹک رہی تھین اسلام کی جمہوریت اور مسلمانون کی عالمگیر اخوت کے صدقہ مین ان کی قوت بازو بن گئین ۔ مگر اس بدبختی اور نامرادی کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ باوجود سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے مسلمان ایک مرکز پر جمع نہین ہونا چاہتے۔

اور اس لئے نہیں ہونا چاہتے کہ ان میں سے ہر اس شخص کو جسے اپنی محدود قابلیت اور رسوخ پر کچھ بھی تاثر ہوتا ہے اپنا علیحدہ مرکز اور دائرہ عمل قائم کرنے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فرزندانِ توحید کی تعداد آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اور اگرچہ دنیا کا کوئی اسلامی ملک آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ مسلمانانِ ہند کی پستی اور ذلت اسلام کے جسمانی نظام میں ایک ایسا رستا ہوا ناسور ہے جس کا اثر اسلامی حکومتوں کی آزادی اور خودمختاری کے لئے خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔
ہندوستان میں سینکڑوں نہیں ہزاروں اسلامی انجمنیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ مسلمانوں کا دین اور دنیا درست ہو جائے مگر جب نتائج پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو نتیجہ برعکس نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی قوت روز بروز زائل ہو رہی ہے اور زائل کیوں نہ ہو جبکہ ان کی پوری قوت ایک دوسرے کی تخریب اور تذلیل پر صرف ہو رہی ہے صاف ظاہر ہے کہ جسقدر زیادہ انجمنیں بنائی جائیں گی یا دوسرے الفاظ میں جسقدر زیادہ مرکز قائم کئے جائیں گے مسلمان زیادہ تباہ اور پریشان حال ہوتے جائیں گے۔
وہ کیا چیز ہے جو افراد یا جماعتوں کے اندر ایک علیحدہ مرکز قائم کرنے کا ہلاکت آفریں جذبہ پیدا کرتی ہے؟ وہی ملوکیت یعنی ایک چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر اپنے اقتدار کے دائرہ کو محض اس مقصد سے وسیع کیا جائے کہ اس سے نفسانی خواہشات کے پورا کرنے کی صورت نکل آئے۔ نفسانی خواہشات کا سب سے بڑا عنصر ہر ممکن سے ممکن طریق سے سیم وزر کی فراہمی ہے جس کے ذریعے لوگوں کے اخلاق اور ایمان کی متاع پر کامیابی کے ساتھ حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیاد رکھنے والے اپنے جنگی کارناموں کی وجہ سے خواہ کیسے ہی بڑے آدمی خیال کئے جائیں لیکن اخلاقی اور روحانی پہلو سے ان کی زندگی ایسی نہیں جو انسانیت کے لئے مایہ ناز ہو۔ وہ ابتدا میں ڈاکو تھے اور جب ان کی ڈکیتی کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا گیا اور خدا کی کمزور مخلوق نے ان کی وحشیانہ طاقت کے سامنے سرِ تسلیم خم

کردیا تو ان کی ڈکیتی نے ملوکیت کی صورت اختیار کرلی۔ ملوکیت کے حامیوں نے بہت جلد اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اگر دنیا میں ملوکیت کی بنیادیں مستحکم ہوسکتی ہیں تو اسی صورت میں کہ جمہور کے دلوں سے جمہوریت کے تصور کا نقش حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے تاکہ بادشاہ انکی نافرمانی اور سرکشی کے نتائج سے خواہ وہ کیسے ہی جائز مطالبات پر مبنی ہوں محفوظ رہے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ملوکیت پرستوں نے دنیا کے سامنے مذہبی رنگ میں یہ عقیدہ پیش کیا کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے۔ شاہ پرست جماعت جس کی ذاتی اغراض اس امر کی متقاضی تھیں کہ اس عقیدہ سے لوگوں کے دلوں پر ہیبت اور خوف کی کیفیت طاری کی جائے بتدریج حصول مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ عوام نے سچ مچ بادشاہ کو خدا کا سایہ سمجھنا شروع کردیا۔ بادشاہ اور رعایا کے درمیان رعب اور اقتدار کی ایک ایسی وسیع اور عمیق خلیج حائل ہوگئی کہ کمزوروں اور مظلوموں کا بادشاہ تک پہنچنا ناممکنات سے تھا۔ شاہ پرستوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ رعایا کے جذبات اور حسیات سے بادشاہ کو بالکل بے خبر رکھا جائے تاکہ انھیں من مانی کارروائی کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

آہ! انسان کی بیچارگی مظلومیت اور غلامانہ زندگی نے اس کی سیرت کو اس قدر مسخ کردیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ فانی ہستی جس کے ہاتھ سینکڑوں نہیں ہزاروں بیگناہوں کے خون سے آلودہ ہیں جس نے غریبوں یتیموں اور بیواؤں کے مال کو غصب کرکے اپنا خزانہ بھر رکھا ہے جس نے بیکسوں اور بے زبانوں کے حقوق کی پامالی سے اپنے جاہ و جلال کی بنیاد مستحکم کر رکھی ہے ظل اللہ یعنی خدا کا سایہ ہے حالانکہ وہ اپنے افعال اور اعمال کے لحاظ سے خدا کا نہیں بلکہ شیطان کا سایہ ہے۔ ایسی ظالم ہستی کو خدا کا سایہ قرار دینا یقیناً ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ دنیا کے جن جن حصوں پر فرعون صفت بادشاہوں کا سایہ پڑا وہاں جلدی یا دیر میں قہر الٰہی نازل ہوا اور ان کی سلطنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں۔ ہمیں رنج اور افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ بجز چند مستثنیات کے مسلمان بادشاہوں نے بھی اسلام کی

جمہوریت کے مقدس اصول کا مطلق احترام نہ کیا۔ انہوں نے خدا کی فرمانبرداری اور رضاجوئی پر اپنی شوکت وسطوت کے قیام کو مقدم اور ضروری خیال کیا۔ یہ اسی نافرمانی اور سرکشی کا نتیجہ ہے کہ فرزندانِ توحید جن کی تعداد اس وقت چالیس کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے دنیا کے ہر حصہ میں ذلیل وخوار نظر آتے ہیں۔ وہ اس گئی گذری حالت میں بھی دنیا کی محفل اقوام میں اپنے لئے ایک معزز جگہ حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کے بھولے ہوئے سبق کو اپنی زندگی کا دستور العمل قرار دیں جسکی بدولت وہ باوجود مٹھی بھر ہونے کے اپنے دشمنوں پر بھاری تھے۔ مسلمانوں کی ہستی کا راز ان کی کثرتِ تعداد میں نہیں بلکہ قوت عمل میں پوشیدہ ہے۔

لڑکا۔ ابا۔ آج میں نے ایک پیشنگوئی کرنے والے کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ اس نے کہا کہ تمہیں ایک نئی سائیکل ملیگی۔

باپ۔ اسی لئے میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہاتھ دیکھنے والے کبھی سچ نہیں کہتے۔

ضعیف العمر معلّمہ۔ لڑکیو! بتاؤ "میں خوبصورت ہوں" میں کونسا زمانہ پایا جاتا ہے۔

ایک لڑکی۔ استانی جی۔ ماضی۔

سوال۔ کیا تم اس کے شوہر ہو۔

جواب۔ نہیں میں اب اس کا بھائی ہوں۔ کیونکہ اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔

رام گنیش گڈکری

رام گنیش گڈکری مرہٹی زبان کا ایک گرانپایہ شاعر گذرا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی طرح یہ مرہٹی کا زبردست شاعر۔ ڈرامہ نویس اور ادب لطیف کا انشاء پرداز تھا افسوس کہ نہایت کم عمری ہی میں وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا مہاراشٹر کے باشندے اس کی جوانا مرگ کو اس وقت تک مرہٹی زبان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان تصور کرتے ہیں۔ اس کی تصنیفات میں ۔ پلنبہ پربھاؤ ۔ بھاؤ بندھن ۔ راج سنیاس ۔ رکام پناجی اور رکام گیری۔ وغیرہ نہایت ہردلعزیز کتابیں ہیں اور مرہٹی لٹریچر کی سرمایۂ ناز خیال کیجاتی ہیں

ذیل میں ہم اس زبردست شاعر کی ایک مختصر نیچرل نظم کا ٹھیٹھ ترجمہ دیتے ہیں۔ ہم نے "ادبستان" کی اس اشاعت کے لئے اس کی بیشمار نظموں میں سے جس نظم کا انتخاب کیا ہے۔ وہ اردو کے لحاظ سے ایک "پامال" موضوع پر کہی گئی ہے۔ لیکن جس بلند پروازی۔ رنگینی اور ندرت کا ثبوت اس نظم میں دیا گیا ہے وہ شاید اردو میں ایک نئی چیز ہے۔

ہم انشاء اللہ اگلی اشاعت میں اس شاعر کی کوئی طویل "تاریخی" یا "نیچرل" نظم پیش کریں گے۔

(نوٹ) [اس سلسلہ میں جناب اسلامی کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صاحب موصوف مرہٹی کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ اگرچہ آپ کے نام سے اردو دنیا بخوبی واقف نہیں ہے۔ تاہم آپ کی "سادہ بیانی" اور "حسن ترجمہ" آپ کے زور طبع کا کافی وکیل ہے۔]

کلی

(۱)

فضا کو کس درجہ اے کلی ! تو — شمیم گل سے بسا رہی ہے
تجھے کسی سے غرض نہیں ہے — مگر تو سب کو ہنسا رہی ہے

(۲)

تو حسن صبر آزما سے اپنے — دلوں پہ بجلی گرا رہی ہے !
مجھے تری پہلی مسکراہٹ — ابھی تلک یاد آ رہی ہے !

---

(۱)

تری جو رنگت بدل رہی ہے — نیا جنم اور پائیگی تو !
اور اس میں کیا شک اکہ ہم سبھوں کو — بہت سی باتیں بتائیگی تو !

(۲)

دماغ و دل کے مطالعہ کو — نقاب رُخ جب اٹھائیگی تو !
سنی نہ ہونگی کبھی کسی نے ! — وہ داستانیں سُنائیگی تو !

---

(۱)

میں پھول سے تیرے خوش ہوا ہوں — مجھے تو جلوہ دکھا دیا کر
کلی کی صورت میں جب تو آئے — اسی طرح کھل کھلا دیا کر

(اسلامی)

نسائیات

بسم اللہ خوانی

(از جناب بدرالدین صاحب)

یوں تو تمام مسلمان اس رسم کو حسب دستور ادا کرتے رہتے ہیں مگر ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اس تقریب کی غرض اور حقیقت سے واقف ہو کر اس کو انجام دیتے ہوں۔ جہاں تک دیکھا گیا ہے والدین محض ارمان نکالنے کی غرض سے بچوں کی بسم اللہ خوانی کیا کرتے ہیں جس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ آج بچے کی بسم اللہ خوانی بڑی دہوم دھام سے کی اور کل سے کھیل کود شروع ہوا تختی باقاعدہ بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ بچے کی بسم اللہ کس غرض سے کی گئی اور اوس کی کونسی ضرورت لاحق ہوئی انھوں نے تو اس رسم کو ایک عام رواج اور خوشی منانے کا دن سمجھ لیا ہے۔ اگر اس تقریب کا یہی حال ہے تو مسلمانوں کے بچے کیونکر تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے بچے جو اکثر جاہل نظر آتے ہیں اسکی یہ ایک وجہ ہے ورنہ بعد بسم اللہ خوانی چار چار حروف بلاناغہ پڑھائے جائیں تو رفتہ رفتہ بچے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی بسم اللہ خوانی کی عمر قدرتاً اثر پذیر ہوا کرتی ہے جو کچھ اوس وقت انکے ذہن نشین کیا جائے نقش ہو جاتا ہے۔

والدین کے حقیقی ارمان بچوں کی بسم اللہ خوانی سے اوس وقت ہی نکل سکتے ہیں جبکہ بچہ تعلیم یافتہ ہو۔ اگر بسم اللہ خوانی کی بسم اللہ ہی غلط نکلی اور بچہ ان پڑھ رہا تو یکے نقصان مایہ و دیگر شماتت ہمسایہ کا مضمون ہوگا۔ اسلئے کہ جاہل بچوں سے جو صدمے والدین کو پہنچتے رہتے ہیں اوس سے ہر فرد بشر واقف ہے۔

اگر والدین اس رسم کی اصل حقیقت کو مدنظر رکھکر بسم اللہ خوانی کریں اور اوسی دن سے

نسائیات

تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں تو آئندہ انھیں حقیقی خوشی حاصل ہوگی اور ان کے حقیقی ارمان نکلیں گے اتنا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے تمام بچے خواندہ نظر آئیں گے شاید ہی کوئی ایسا کم نصیب بچہ ہوگا جو جاہل کہلائیگا۔ حقیقت کو نظر انداز کیا جائے اور فقط پلاؤ اور بریانی ہی کو بسم اللہ خوانی سمجھی جائے تو ممکن نہیں کہ اوس سے کوئی فائدہ پہنچے اور والدین کو اس سے کچھ سرخروئی حاصل ہو۔ البتہ تھوڑی دیر کے لئے انھیں اپنی غلط فہمی سے مصنوعی خوشی حاصل ہوسکتی ہے مگر اوس کا خمیازہ آگے چلکر عمر بھر انھیں بھگتنا پڑتا ہے۔

نوائے نعت

(از فرمودۂ بیگم مستور)

اک کیف بیخودی جو یہ دل میں جگر میں ہے
کس کی نگاہِ ناز کا جلوہ نظر میں ہے

جلوہ احد کے نور کا ہر بام و در میں ہے
اک نیست سا وجود ہے جو بحر و بر میں ہے

نالے پہنچ نہ جائیں اجابت کے در تلک
لذت عجیب سوز میں درد جگر میں ہے

ہے عکس یہ بھی اک دلِ سوزاں کے داغ کا
تابش جو آفتاب میں۔ دھبہ قمر میں ہے

جس ہستئ بزرگ کی خاطر ہے دو جہاں
اللہ رے وہ ذات بھی نوعِ بشر میں ہے

موسیٰ سے کہدو۔ ہوگئے بیہوش کس لئے؟
جلوہ اسی حسین کا ہر دم نظر میں ہے

مستور کو خیال ہے روزِ حساب کا
گو حاصلِ حیات تری اک نظر میں ہے

پاسبان فلک

(از جناب عبدالغفور صاحب فاضل)

اے نخلِ شامِ مرغ شب افروز ماہ تاب	تو ہے نگار عامِ ترا حُسن بے نقاب
وہ طفلِ نور نور سے ہیں تیرے جلوہ تاب	اور خواب گاہ غول نے پائی ہے تجھ سے آب

کیا طشتِ خاک نُور سے پُر نور ہو گئی
ظلمت جہاں سے آن میں کافور ہو گئی

جب طشتِ خوں پہ ہو گیا جلوہ تیرا عیاں	تھے طشتِ خاک نور سے پُر نور سب مکاں
سیارے تیرے نور سے سب ہو گئے نہاں	لمعانِ نور سے ترے روشن ہوا جہاں

معمور تیرے نور سے گلزار بھی ہوئے
نیلی نقاب دشت بھی کہسار بھی ہوئے

تیرا عروج ماہ میں منظرِ ہلال تھا	تو ہی زوالِ ماہ میں بدرِ کمال تھا
بے نور ہفت بانو تھے اُن پر زوال تھا	تیرا عروس عدن میں جاہ و جلال تھا

وہ طفلِ نور نے بھی ضیا تجھ سے پائی ہے
وہ صحن میں بھی روشنی تیری سمائی ہے

اے زینتِ فلک مہِ انور لقائے نور	شرمندہ تارے ہوتے ہیں جب ہو ترا ظہور
فرحت ہو دل کو تجھ سے اور آنکھوں میں بھی ہو نور	اے روشنیِ حُسن جہاں باعثِ سرور

کیا چاندنی ہے تیری سفیدی ہے نور کی
گویا زمیں نے اوڑھی ہے چادر بلور کی

غزل

(از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم-اے - بڑودہ)

سناتے ہیں عبث قصہ مجھے بخت سکندر کا
مجھے مل جائیگا لکھا ہے جو میرے مقدر کا

دماغ افلاک پر ہے گو ہیں فرش خاک پر بیٹھے
نظر آتا ہے دل ہی میں تماشا جم کے ساغر کا

تجھے مشق ستم کرنا ہے ظالم شوق سے کرلے
ہے پتھر کا کلیجہ میرا دل تیرا بھی پتھر کا

یہ ممکن ہے کہ راز الفت کا لب افشا نہ ہونے دیں
مگر کچھ اور ہی نقشہ ہے اپنے دیدۂ تر کا

بھری محفل میں وہ رسوا نہو جائے کہیں اے دل
نہ لینا نام بھولے سے بھی محشر میں ستمگر کا

نگاہِ یار میں پر لگ گیا ہے ناز کا ورنہ
نشانہ کب اڑا سکتا جو ہوتا تیر بے پر کا

جناب خضر کیا جانیں کہ مرنا اسپہ کیا شے ہے
حیات جاوداں ہے اسکی تیغ ناز کا چرکا

جو دیوانے ہیں تیرے ان کا عالم ہی نرالا ہے
نہ کچھ پا کی خبر ان کو نہ ہی کچھ ہوش ہے انہیں سر کا

اسی کو دوستی کہتے ہیں کیا - انصاف کر تو ہی
تری ہر بات ناصح کام کر جاتی ہے خنجر کا

ہوئی ہے زر پرستی دین و ایماں آجکل ایسی
سوا اللہ کے کوئی نہیں اب آہ بے زر کا

کہیگا مدعی کیا جسپہ گذری ہو وہی جانے
مزہ پوچھو تو کچھ بسمل سے پوچھو آب خنجر کا

میں خوش اسپر بھی ہوں ساقی مگر ہے تیری بدنامی
دیا جام سفالیں مجھکو وہ بھی خیر سے در کا

ہے دنیا مردنی کیا مال نواب اسکی نظروں میں
دو عالم سے ہے مستغنی جو سائل اسکے ہے در کا

انگلستان میں مچھلی کی تجارت

اگر آج کوئی مچھلی بیچنے والا اپنے کسی خریدار سے کہے کہ "جناب یہ مچھلیاں آج ہی سمندر سے آئی ہیں" تو وہ اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھیگا۔ کیونکہ لندن اور اسی قسم کے دوسرے بڑے شہروں میں یہ قطعی غیر ممکن ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں تازہ شکار کی ہوئی مچھلیاں روز کی روز بہم پہنچتی رہیں۔ لیکن وہ دن دور نہیں جبکہ مچھلی بیچنے والے بہت آسانی سے اپنے گاہکوں کو اس بات کا یقین دلاسکیں گے کہ "یہ مچھلیاں ابھی ابھی آئی ہیں" کیونکہ اب یہ انتظام کیا جارہا ہے کہ سمندر سے مچھلیاں پکڑکر ایک تالاب میں پالی جائیں وہ اسی میں انڈے دیں۔ بچے پیدا ہوں اور تعداد بڑھتی جائے۔ چنانچہ یہ کام ایک چھوٹے پیمانہ پر شروع بھی کردیا گیا ہے جسمیں ایک بڑی مدتک کامیابی ہوئی ہے۔ یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مچھلیوں کو تالابوں میں مقید کرکے پالنے سے کیا فائدہ جبکہ سمندر ان سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن تحقیق وتفتیش سے معلوم ہوا ہے کہ مچھلیوں کے انڈے سمندروں میں سلامت نہیں بچتے جن سے کسی اضافہ کی امید ہو۔ کیونکہ دریائی جانوروں میں وھیل مچھلی سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جانور تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور عموماً اسی پر گذارہ کرتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک لاکھ انڈوں میں صرف ایک انڈا بچتا ہے جس سے مچھلی پیدا ہوتی ہے۔ ان اعداد وشمار کو دیکھتے ہوئے مجبوراً اس بات کا بیڑہ اٹھایا گیا ہے کہ مچھلیوں کے انڈوں کی حفاظت کیجائے تاکہ ان کی تعداد میں کمی واقع نہ ہوسکے۔

چنانچہ جب مچھلیوں کے انڈے دینے کا زمانہ آتا ہے تو بہت سی کشتیاں سمندروں میں صرف اسی لئے پھرتی رہتی ہیں کہ وہ سطح آب پر بہتے ہوئے انڈوں کو جمع کریں۔ اور

پھر وہ انہیں تالابوں میں پہنچا دیئے جاتے ہیں جو خاص اس مقصد کے لئے طیار کئے گئے ہیں اور جنہیں نلوں کے ذریعہ سے ہر وقت سمندر کا تازہ پانی آتا رہتا ہے۔

مچھلی کے انڈے نہایت نازک ہوتے ہیں اور ذرا سی غفلت سے ہزاروں کی تعداد میں ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ان کی بہت حفاظت اور نگرانی کیجاتی ہے۔

جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو انہیں تالابوں سے نکال کر سمندر کے ان حصّوں میں چھوڑ آتے ہیں جہاں ماہی گیری بہت آسان ہے تاکہ دوبارہ پکڑنے میں زیادہ دقت نہو۔ اس قسم کے تالاب پورٹ ایرن میں بنائے گئے ہیں۔ اس تالاب میں ایک لاکھ تیس ہزار گیلن پانی آتا ہے۔ اور صرف ایک موسم میں اسّی لاکھ بچے پیدا کئے گئے ہیں۔

شفاخانوں کا ابتدائی دَوْر

ایک سرسری نظر

۱۶۶۵ء میں جب طاعون کی زبردست وبا پھیلی تو اس وقت لندن میں صرف تین یا چار ہسپتال تھے عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مرض ہوا کے ذریعہ سے پھیلتا ہے چنانچہ سڑکوں اور گلیوں میں آگ جلائی گئی۔ پھر لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ مرض جانوروں کے ذریعہ سے پھیلتا ہے اور اس لئے چالیس ہزار سے زیادہ کتے اور بلیاں لندن کی سڑکوں پر مار ڈالی گئیں۔ ہسپتالوں میں سائنٹفک اصول پر امراض کی جانچ پڑتال تقریباً سو سال ہوئے کہ شروع ہوئی۔ اور گذشتہ پچاس سالوں میں طبابت اور جراحی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اسوقت تقریباً بیس ہزار مریض لندن کے ہسپتالوں کے کمروں میں روزانہ قیام پذیر رہتے ہیں۔ گذشتہ سال ان ہسپتالوں کے نو ہزار سے زیادہ مصنوعی اعضاء لوگوں کو دئے گئے جنہیں ساڑھے تین ہزار دانت۔ نو سو عینکیں اور دو ہزار مصنوعی پاؤں شامل ہیں۔ لندن میں ایک ہاسپٹل سنڈے فنڈ ہے جسیں لوگ اسلئے چندے دیتے ہیں کہ ان سے شفاخانے کھولے جائیں اس فنڈ کو قائم ہوئے تقریباً ۶۰ سال گذرے ہیں اور اسوقت تک اس میں سے مریضوں پر

معلومات

آج کل دنیا کے سائنس داں حلقوں میں اس تجویز پر بہت دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ تمام روئے زمین کی اس گہرائی تک کیمیائی اور جماداتی تحقیقات کی جائے جہاں تک اس وقت تک کوئی نہ پہونچ سکا ہو۔

اس سلسلہ میں میکگل یونیورسٹی میں جو کوششیں کی گئیں ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ دور حاضرہ کی انجنیر تک بارہ میل کی گہرائی تک کامیابی کے ساتھ تحقیق و تفتیش کر سکتی ہے۔ اور بعض مقامات پر بیس میل کی گہرائی بھی کوئی بڑی چیز نہیں۔ دنیا کی انتہائی گہرائی جو اس زمانہ کی سائنس کا نتیجہ ہے۔ وہ برازیل میں مورو ویلہو کی کان ہے۔ جہاں سوا میل کی گہرائی پر سونا اور چاندی نکالی جاتی ہے۔

اس نئی تجویز کو بروئے کار لانے میں انجنیروں کو جو سب سے بڑی دقت پیش آئیگی وہ شدید گرمی کا مقابلہ کرنا ہے۔ سطح زمین سے نیچے کی جانب ہر تیس گز کے بعد ٹمپریچر ایک ڈگری بڑھ جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دو میل کی گہرائی میں پانی کھولنے لگے گا۔ اور پچیس میل کی گہرائی میں دنیا کی سب سے زیادہ سخت دھات بھی پگھل جائیگی۔

دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا نام انگریزی کے بعض حروف تہجی کے نام پر ہے۔ چنانچہ ہالینڈ میں ایک دریا ہے جس کا نام "وائی" ہے۔ چین کے شہر کا نام "یو" اور سویڈن کے ایک قصبہ کا نام "اے" ہے



کیمبرج کے ایک سائنٹسٹ نے عجیب آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ تمام خفیہ خبریں معلوم کیجا سکتی ہیں جو دماغ رگوں کے مرکز کو پہونچاتا ہے۔ یہ آلہ بالکل وائرلس کے

آلہ کے جیسا ہے جسمیں ایک فوٹو گرافک پلیٹ بھی لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ جب یہ رگوں پر لگایا جاتا ہے تو اسی فوٹو گرافک پلیٹ پر تمام خبریں بہت سے نقطوں اور خطوں کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ آلہ اس قدر "موثر" ہے کہ اس کے ذریعہ سے مینڈک کے دماغ کی خبریں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

×××

دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز سلسلۂ آب رسانی لندن کی سڑکوں کے نیچے ہے۔ اس شہر میں اکیسو اسی میل سے زیادہ لمبائی کے پائپ لگے ہوئے ہیں۔ ان پائپوں میں پانی کا وزن بہت ہی زیادہ ہے۔ جس کا اوسط فی مربع انچ سات سو پچاس پونڈ ہے۔ اور گذشتہ سال دو کروڑ چالیس لاکھ گیلن فی ہفتہ سے زیادہ پانی خرچ ہوا۔ لندن کی حیرت ناک ترقی کا اندازہ صرف اسی امر سے ہو سکتا ہے کہ اب سے تیس سال پیشتر صرف ساٹھ لاکھ گیلن فی ہفتہ پانی خرچ ہوتا تھا۔

دنیا میں "گئوسالے" "اصطبل" "چڑیا خانے" وغیرہ تو بہت ہیں لیکن "شیر خانہ" صرف ایک ہی ہے۔ جو کلیفورنیا میں واقع ہے۔ اس کی عمارت دو ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی ہے جس کے کنارے کنارے بلند فصیل ہے۔ اور اس میں چوہتر شیر پلے ہوئے ہیں۔

شیرنیاں سال میں دو مرتبہ بچے دیتی ہیں۔ ایک بچہ کی قیمت ۵۰ پونڈ اور ایک پورے شیر نر کی قیمت دس ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ اکثر یہ جانور فلم اور سرکس کمپنیوں میں کام کرنے کے لئے کرایہ پر بھی دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک شیرنی نے اسی طرح چار سو پونڈ کی آمدنی کی۔

لیکن ان کی دیکھ بھال کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ خصوصاً بچوں کی پرورش میں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان شیروں کو گھوڑے کا گوشت کھلایا جاتا ہے۔

بعض تتلیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے منہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی مختصر زندگی بھر کچھ نہیں کھاتیں۔

محمد عبد الرحمن نے خلافت پریس واقع سلطان منشن ڈونگری بمبئی نمبر ۹ میں چھاپا۔ اور رشید صدیقی نے دفتر ادبستان ۱۶۳ درمین روڈ بمبئی نمبر ۱۴ سے شائع کیا۔



دو چیز ازبزم میخواران پسند آمد مرا صائب - زپا افتادن ساقي بسر غلطيدن مينا

امریکن استیج پر ایران کي تاریخ قدیم



امریکہ کي ایک کمپني نے ایران کي تاریخ قدیم کا ڈرامہ تیار کیا ھے جو پبلک مین نہایت پسند کیا گیا ھے اس تصویر مین ایران کے مشہور بادشاہ کیخسرو کا پارٹ دکھایا گیا ھے۔

۷۸۶

رجسٹرڈ نمبر .... بی - ۲۱۵۰

انجمن معین الادب کا علمی و ادبی

جلد ۱ رسالہ نمبر

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

ادبستان

مرتب

رشید صدیقی

معاون — منیر الہ آبادی

معاون — خلیل احمد سکروی

قیمت فی پرچہ اندرون بمبئی ۴ر

قیمت فی پرچہ بیرون بمبئی ۶

بزمِ ادب

پچھلے دنوں گورنر بمبئی نے پونہ کی زنانہ یونیورسٹی کی نئی عمارت کا افتتاح کیا۔ اور اپنی تقریر میں یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو گورنمنٹ سے امداد حاصل کرنے کے ذرائع بتائے۔ تاکہ یہ کام اعلیٰ پیمانہ پر زیادہ بہتر صورت میں انجام دیا جائے۔ یہ یونیورسٹی جو اسوقت ہندوستان کی ممتاز اور معروف ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ دس سال قبل محض ایک معمولی مدرسہ تھی جسکی بنیاد پروفیسر کاروے نے رکھی تھی۔ اور انہی کا علمی شوق وانہماک اس کی ترقی اور فلاح کا کفیل رہا ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں میں تعلیم نسواں اب اختلافی مسئلہ نہیں سمجھا جاتا غالباً ہر فرد کو اس امر سے اتفاق کلی ہے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے اور ضرور دی جائے۔ البتہ نصاب اور طریقۂ تعلیم جیسی چند ضروری شقیں غور وفیصلہ کی محتاج ہیں۔ لیکن یہ کوئی زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ اسلئے کہ موجودہ تمدن اور زمانہ کی ہوا نے اچھی طرح یہ سبق ہمارے ذہن نشیں کردیا ہے کہ ترقی کی بادیہ گردی میں جب تک ہم عورتوں کو شریک وسہیم ہونے کے قابل نہ بنائیں گے کامیابی یقینی نہیں۔ اب سوال یہ نہیں کہ وہ خود مرد میدان بنکر عرصۂ عمل میں آئیں۔ بلکہ ضرورت یہ ہے کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ ہر پیش نظر معاملہ کی نزاکت واہمیت کا صحیح اندازہ لگا سکیں تاکہ میدانِ عمل میں سرگرم کار ہونے کے لئے وہ ہماری مددگار ہوں۔ اور ہمیں اس مقصد کے لئے بالکل موقعہ اور آزادی دیں۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کے لئے انکی تعلیم کوئی دشوار چیز نہیں ہے۔ اور نہ اس کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ عام علوم وفنون کی تعلیم جو اسوقت مدارس میں رائج ہے ان کے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہے۔ البتہ بشرطِ ضرورت اس میں کسی قدر ترمیم وتنسیخ کرلی جائے۔ بہرحال یہ امر تو قطعی ہے کہ مسلمان خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام جلد از جلد شروع کردینا چاہئے۔

بمبئی جیسے کاروباری شہر میں اس کام کی ابتدا زیادہ دشوار نہیں اگرچہ میونسپل

مدارس میں مسلمان بچیوں کی تعلیم کا خاصا انتظام ہے لیکن یہ تعلیم محض ابتدائی ہے ۔ اور کسی طرح قومی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی ۔ اگر دوسری اقوام سے اس باب میں اشتراک عمل ممکن ہے تو غنیمت ورنہ مسلمانوں کو جلد علیٰحدہ اور بہتر انتظام کرنے کی سعیِ بلیغ کرنی چاہیئے ۔

ملک میں اسوقت بکثرت مغربی دار العلوم موجود ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل وطن کو نادان بھیڑوں کے گلہ کی طرح اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا ۔ جس طرف ایک کا منھ اٹھ گیا سب اسیطرف کو ہولئے ۔ اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان یونیورسٹیوں کی سندوں کی نہ کوئی قدر ہے نہ وقعت ۔ ان نوجوانوں کو جو اِن سندوں کے حصول میں عمر عزیز کا ایک حصہ نذر کر دیتے ہیں کاروباری دنیا میں فکر معاش کے لئے ہنوز روز اول ہی کا نقشہ نظر آتا ہے ۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت اس نقطۂ نگاہ سے ابھی بہت پست ہے اور ان کے لئے کافی موقع ہے کہ وہ یونیورسٹیوں میں داخل ہوں ۔ لیکن کیا ہی بہتر ہو کہ ہم ابھی سے مآل پر نظر رکھیں اور قبل اس کے کہ .... سب کے سب ایک ہی تعلیم حاصل کر کے بیکار اور عضو معطل ہو جائیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم مختلف شعبہائے حیات سے متعلق مختلف علوم و فنون کی طرف راغب ہوں ۔ صنعت و حرفت زراعت و تجارت وغیرہ کا میدان تنگ نہیں ۔ تمدن کے ساتھ ساتھ یہ تمام چیزیں ترقی پذیر ہیں ۔ لیکن لائق و تجربہ کار آدمیوں کا ہر طرف کال ہے ۔ موجودہ یونیورسٹیوں میں یہ تمام چیزیں بھی داخل کی جائیں اور ان کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ بھی یونیورسٹیاں قایم کی جائیں ۔ ورنہ بغیر اس کے قومی تعلیم ناکارہ رہے گی ۔

پنڈت ڈی ۔ اس ۔ آر ۔ شاستری نے اسی موضوع پر ایک دلچسپ مضمون Educational Review میں لکھا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ :-

" جب ہم یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ کی آواز سنتے ہیں تو چشم دماغ کے سامنے اس کا ایک غیر مطمئن سا نقشہ پھر جاتا ہے ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

یہ غیر مطمئن حالت کیوں ہے کس وجہ سے ہے اور کیوں کر ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں ان یونیورسٹیوں کی تعریف" پالش کئے ہوئے بھڑکیلے پتھر اور معمولی ہیرے" ہے جس میں سے ہر سال بہت سے بھڑکیلے اور چکنے چپڑے پتھر نکلتے ہیں جو صرف ایک ہی کام کے ہوتے ہیں یعنی سرکاری ملازمتوں میں داخل ہوکر اپنی قوت تحریر صرف کریں۔ اگر رابنسن کروسو کی طرح وہ کسی ویران جزیرہ میں چھوڑ دئے جائیں تو بھوکوں مر جائیں۔ یہ گریجویٹ جب یونیورسٹی سے باہر نکلتے ہیں تو آزاد مغربی اصولوں پر اپنی تعلیمی زندگی اور کاروباری دنیا کی محنت طلب زندگی میں زمین و آسماں کا فرق پاتے ہیں۔ یونیورسٹی کی ڈگریاں اور ڈپلومے اتنے عام ہوگئے ہیں کہ اب ان کی کوئی عزت و وقعت باقی نہیں رہی۔ پھر کون ہے جو عرصہ دراز تک صبر و شکر کے ساتھ محنت کرنے پر اس قلیل نفع کا متمنی ہوگا"

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ یونیورسٹیوں میں یا تو اُن ضروری اجزا کا اضافہ کر دیا جائے جو قوم کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ یا ان کے علاوہ مدرسے قائم کئے جائیں۔ لارڈ سنہا نے بھی حال ہی میں Bihar & Orissa Co-operative federation Gazette (بہار اینڈ اڑیسہ کوآپریٹیو فیڈریشن گزٹ) کے نمائندہ سے کسیقدر اختلاف کے ساتھ اپنی خیالات کا اظہار کیا ہے جس کا اعادہ غالباً سود مند ہوگا۔ نامہ نگار مذکور لکھتا ہے کہ :-

"یونیورسٹی کی تعلیم کے سوال پر انہوں (لارڈ سنہا) نے کہا کہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یونیورسٹی کی تعلیم کی ہم نے جس طرح مخالفت کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ لیکن اس باب میں ہمارا طرز عمل نادرست اور غیر موثر رہا۔ کیونکہ اس مخالفت کی تائید میں جو قومی مدارس کھولے گئے وہ انہی یونیورسٹیوں کے نمونے تھے اور اسی لئے ناکام رہے۔ لارڈ موصوف نے کہا کہ ہزاروں نوجوانوں کی ضرورت ہے جو یونیورسٹی کی ڈگریوں والے نوجوان نہیں بلکہ وہ جو زراعت، اصول صحت و صفائی میں دیہاتوں

کے "گرد" کا درجہ رکھتے ہوں۔ انہیں تواریخ، جغرافیہ، ریاضی اور زبان کی عام معلومات ہوں تاکہ وہ دیہاتوں میں گھر گھر ابتدائی تعلیم دیں۔ اپنے اس قول کی تصدیق و ثبوت میں۔ صاحب موصوف نے بیان کیا کہ میں نے اپنے گاؤں کے پاٹھشالہ میں جتنی ریاضی لکھی تھی وہ میری زندگی کے لئے کافی ثابت ہوئی۔ بڑی سے بڑی پبلک خدمت کی انجام دہی میں بھی مجھے کبھی اس سے زیادہ ریاضی کی ضرورت نہیں پیش آئی اور ہائی کورٹ میں طول وطویل حسابوں کی جانچ پڑتال میں بھی مجھے کبھی اس سے زیادہ کچھ نہ کرنا پڑا۔ لارڈ موصوف نے یہ بھی لکھا کہ اس تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا اضافہ کردیا جائے پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں باقی رہتی۔ اور تعلیم کے عام کرنے کا جو مقصد ہے وہ بلا جبری تعلیم کے حاصل ہوجاتا ہے۔ موصوف نے اس طریقۂ تعلیم کے متعلق اپنے کامل یقین اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس خیال کی تبلیغ میں سرگرم ہوں۔ چنانچہ اپنے اعزا میں سے تمام ان نوجوانوں کی جو یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتے تھے میں نے یہی یہ صلاح دی ہے اور اس خیال سے روکنے کی کوشش کی ہے"

لارڈ سنہا نے جن قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ حقایق ہیں جنکا کم وبیش تجربہ ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے۔ پھر کیا یہ مسئلہ ہماری غور اور توجہ کا محتاج نہیں؟ (مرتب)

ہندوستان میں تیل کی تجارت

(از خلیل احمد سیکروی)

ہندوستان تجارتی حیثیت سے دنیا کے دوسرے ملکوں کی بہ نسبت زیادہ اقسام کے oil seeds (تیل پیدا کرنے والے بیج) پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جہانتک تیل پیدا کرنے کے ذرائع کا سوال ہے اس کی حیثیت دنیا میں نہایت اہم ہے oil seeds (تیل پیدا کرنے والے بیج) ملک کے لئے بہت بڑا ذریعۂ آمدنی ہیں کیونکہ ان کی مقدار تقریباً پانچ ملین اور قیمت تقریباً پچاس ملین سالانہ ہوتی ہے۔ فی الحال ہندوستان میں تل۔ تیل اور گھی کی مجموعی برآمد کی قیمت قریب قریب اٹھارہ ملین زرنقد ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان اعداد و شمار میں ابھی اور اضافہ ہو۔ لیکن اس بدنصیبی کا ماتم کس سرزمین میں جاکر کیا جائے کہ تیل پیدا کرنے والے بیجوں کی اس بڑی تجارت اور عظیم نفع سے ہندوستان کو بہت ہی تھوڑا حصہ ملتا ہے۔

تجارتی (oil seeds) کا زیادہ حصہ تیل یا روغن کے حاصل کرنے میں صرف کیا جاتا ہے جو کھانے اور دوسرے روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔ دنیا کی آبادی کے اضافہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تیل اور روغن کی مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔

کھانے کی ضرورتوں میں تیل مختلف طور پر استعمال کیا جاتا ہے مثلاً معمولی طور پر۔ طرح طرح سے صاف کرکے پکا کر۔ مصنوعی مسکہ بنا کر۔ مصنوعی گھی بنا کر وغیرہ غذا کے علاوہ روغن اور بہت سے تیل صنعتی کاموں میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں جن میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ روغن اور تیل کا ایک اہم استعمال صابون اور موم بتی کی تجارت ہے جس سے گلیسرین بھی حاصل کی جاتی ہے۔ تیل اور روغن کی ایک بڑی مقدار چکنائی بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس سلسلہ

میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رینڈی کے تیل سے سائنس کے اصولوں پر جو چکنائی بنائی جاتی ہے اس سے تمام اعلےٰ قسم کی چکناہٹ والی اشیاء طیار کی جاتی ہیں جو طیاروں اور موٹروں وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ رنگ۔ وارنش۔ روشنائی۔ مصنوعی ربر۔ اور مصنوعی چمڑے وغیرہ کی تجارت میں بھی تیل اور خصوصاً خشک ہونے والے تیل مثلاً روغن چوب چینی و روغن خشخاش وغیرہ بہت بڑی مقدار میں صرف ہوتے ہیں۔

تیل کی تجارت میں سب سے آخری چیز کھلی ہے۔ خواہ تیل کولھو میں پیل کر نکالا جائے یا اور ترکیب سے کھلی کا بچ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ کوئی غیر ضروری چیز نہیں۔ مویشیوں کی بہترین غذا اور کھیتوں کے لئے اعلےٰ درجہ کی کھاد ہے۔ اس کی ضرورت اور مانگ اس وقت دنیا کے ہر حصہ میں ہے ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں کھلی جیسی عمدہ اور سستی کھاد کی اہمیت کسی بیان کی محتاج نہیں

ہندوستان میں صدہا قسم کے تیل پیدا کرنے والے بیج پیدا ہوتے ہیں جن میں سے خاص حسب ذیل ہیں:۔

کھوپرہ۔ مہوہ۔ بنولے۔ سرسوں السی۔ رینڈی۔ تل اور خشخاش وغیرہ

تیل کی تجارت کے متعلق ہندوستان میں جو ایک اور قابل افسوس غلطی کی جاتی ہے وہ تیل پیدا کرنے والے بیجوں کا ناجائز استعمال ہے۔ مثال کے طور پر ایک معمولی واقعہ لے لیجئے کہ ملک کے بعض حصوں میں جانوروں کو بیج ہی کھلا دئے جاتے ہیں۔ حالانکہ تیل نکالنے کے بعد صرف کھلی کھلانے میں دو قسم کے فائدے ہیں۔ ہندوستان دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ تیل پیدا کرنے والے بیج باہر بھیجتا ہے۔ وہ خاص ممالک جو یہاں کے (oilseeds) خریدتے ہیں یہ ہیں۔ برطانیہ۔ جرمنی آسٹریا۔ فرانس۔ اٹلی۔ بلجیم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ ان ممالک میں بیجوں سے تیل نکالا جاتا ہے اور پھر وہ مختلف صورتوں میں تبدیل ہوتا ہے جس کا ایک حصہ پھر ہندوستان ہی میں واپس آکر بکتا ہے۔ کھلی وہ اپنے مویشیوں کو کھلاتے ہیں اور زمین کو زیادہ زرخیز بنانے میں صرف کرتے ہیں ہندوستان سے oilseeds کی بہ نسبت تیل بہت کم باہر جاتا ہے

اس طرح ہندوستان اپنے ملک کی ایک بہت بڑی دولت سے فیضیاب نہیں ہوسکتا۔ تیل کی بجائے تیل پیدا کرنے والے بیج ممالک غیر میں بھیجکر ہندوستان نہ صرف تجارتی حیثیت سے خسارہ میں رہتا ہے بلکہ کھلی کے ضائع کردینے کی وجہ سے فربہ مویشی اور زرخیز زمین سے بھی محروم رہتا ہے جو ایک بڑا زراعتی نقصان ہے مندرجہ ذیل نقشہ سے oilseeds کی پیداوار اور تجارت کے لحاظ سے دنیا میں ہندوستان کی اہمیت بخوبی واضح ہوجائیگی۔

نقشہ نمبر ۱

بیج کا نام	تمام دنیا کی برآمد سنہ ۱۹۱۳ء میں (تخمینہ) ٹن	ہندوستان کی برآمد سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء ٹن	ہندوستان اور دنیا کی برآمد کا اوسط (فی صدی)
کھوپرہ -	۵۳۷۰۰۰	۳۸۰۰۰	۷
مہوہ -	ناپید	۳۲۰۰۰	۱۰۰
بنولا -	۹۰۰۰۰۰	۲۸۴۰۰۰	۳۱
تل -	۲۶۴۰۰۰	۱۱۲۰۰۰	۴۲
رینڈی -	۱۳۷۰۰۰	۱۳۵۰۰۰	۹۸
سرسوں -	۲۸۵۰۰۰	۲۴۹۰۰۰	۶۵
السی -	۲۱۵۰۰۰۰	۴۱۴۰۰۰	۲۰
خشخاش -	۲۵۰۰۰	۱۹۰۰۰	۷۶

نقشہ نمبر ۲

ہندوستان میں oilseeds اور ان کے دوسرے لوازمات کی پیداوار اور برآمد سنہ ۱۹۱۳ء :-

اشیار	پیداوار کا تخمینہ	برآمد
السی (ٹن)	۳۸۶۰۰۰	۴۱۴۰۰۰
السی کا تیل -(گیلن)	نامعلوم	۱۰۲۴۰۰
سرسوں اور رائی	۱۰۸۷۰۰۰	۲۵۴۰۰۰
سرسوں اور رائی کا تیل (گیلن)	..	۴۰۷۰۰۰
تِل (ٹن)	۴۰۳۰۰۰	۱۱۲۰۰۰
تل کا تیل (گیلن)	۲۱۱۰۰۰۰	۲۰۸۰۰۰
بنولا (ٹن)	..	۲۸۴۰۰۰
بنولے کی کھلی (ٹن)	..	۱۰۴۰۰
بنولے کا تیل (گیلن)	..	۲۵۰۰
رینڈی (ٹن)	..	۱۳۵۰۰۰
رینڈی کی کھلی (ٹن)	..	۴۹۰۰
رینڈی کا تیل (گیلن)	..	۱۰۰۷۰۰۰
کھوپرا (ٹن)	..	۳۸۰۰۰
کھوپرے کی کھلی (ٹن)	..	۴۲۰۰
کھوپرے کا تیل (گیلن)	..	۱۰۹۱۵۰۰
مہوہ (ٹن)	۳۰۰۰۰	۳۳۰۰۰
خشخاص (ٹن)	..	۱۹۰۰۰
دوسرے بیج (ٹن)	..	۹۰۰
دوسرے بیجوں کی کھلی (ٹن)	..	۴۲۰۰
دوسرے بیجوں کا تیل (گیلن)	..	۱۳۵۰۰۰

اس میں سال گذشتہ کی پیداوار کا بھی کچھ حصہ شامل ہے۔ ہندوستان کے تیل پیدا کرنے والے بیجوں کی پیداوار اور برآمد کا نقشہ (وزن بمقدار ٹن۔ اور قیمت بحساب پونڈ)

سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء سے سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء تک

بیج کا نام		سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء	سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء
السی	پیداوار	۳۹۷۰۰۰	۴۷۶۰۰۰	۵۲۰۰۰۰
	برآمد	۳۲۱۵۷۶	۱۹۲۹۸۷	۳۹۴۱۰۳
	قیمت	۳۵۰۲۴۱۱	۱۹۸۲۷۸۲	۴۷۵۹۹۰۶
رائی اور سرسوں	پیداوار	۱۲۱۹۲۰۰	۱۱۰۲۱۰۰	۱۱۸۱۲۰۰
	برآمد	۹۹۴۶۳	۹۱۳۹۱	۱۲۷۸۲۲
	قیمت	۱۱۲۴۱۱۹	۹۹۴۳۵۴	۱۹۹۷۰۸۵
تل	پیداوار	۵۵۱۰۰۰	۴۸۲۰۰۰	۴۹۳۰۰۰
	برآمد	۴۶۷۰۵	۱۳۷۷۶	۸۳۶۶۵
	قیمت	۷۱۱۸۸۵	۱۶۴۱۷۰	۱۰۸۳۷۲۳
بنولا	پیداوار	۲۱۷۰۴۰۰	۱۵۵۷۳۰۰	۱۷۰۸۴۰۰
	برآمد	۲۰۷۷۸۸	۹۵۶۶۳	۳۹۶۳۰
	قیمت	۱۰۰۴۵۲۴	۴۴۵۰۷۷	۲۰۳۹۴۰
رینڈی	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰
	برآمد	۸۲۸۱۴	۸۷۹۴۸	۹۲۴۴۷
	قیمت	۷۷۳۲۸۹	۸۰۲۱۸۵	۹۵۷۲۰۱
مہوہ	پیداوار	۰۰	۰۰	۰۰

بیج کا نام		سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء	سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء
کھوپرا	برآمد	۷۴۳۷	۴۲۱۵	۴۲۳۹
	قیمت	۵۰۶۷۴	۲۴۳۲۷	۲۶۴۸۰
	پیداوار	..	..	..
خشخاش	برآمد	۳۱۸۴۵	۱۵۶۷۷	۲۶۵۵۶
	قیمت	۸۲۱۹۲۳	۳۸۱۸۵۹	۶۶۵۰۵۸
	پیداوار	..	..	..
چائے کا بیج	برآمد	۶۹۹۲	۶۸۷۱	۵۵۲۴
	قیمت	۹۵۶۱۰	۸۲۰۱۲	۶۳۰۸۵
	پیداوار	..	..	..
دوسرے قسم کے بیج	برآمد	۲۱۹	۱۳۷	۱۳۷
	قیمت	۳۶۴۴۲	۲۸۶۶۰	۲۸۳۷۶
	پیداوار	..	..	..
جملہ	برآمد	۱۲۳۱	۲۸۰۰	۱۹۳۱
	قیمت	۱۱۲۵۸	۲۸۱۱	۱۷۶۸۶
	پیداوار	..	..	..
	برآمد	۹۴۶۷۲۷	۶۹۱۹۸۳	۹۲۰۱۴۳
	قیمت	۹۶۶۹۸۹۷	۶۵۸۲۰۱۷	۱۰۷۷۲۴۱۶

رنیڈی - جہوہ - پوستہ - کھوپرا اور چائے کے بیجوں کے اعداد و شمار نہیں معلوم ہیں
جہانتک نوعیت (Quality) کا تعلق ہے ہندوستان کے تیل پیدا کرنے والے بیج

عموماً دوسرے ممالک کے بیجوں سے گھٹیا نہیں ہیں۔ بلکہ مقدار اور اقسام کے لحاظ سے ہندوستان کو دوسرے ممالک پر ایک خصوصی ترجیح ہے۔ اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ہندوستان کو اس نقصان عظیم سے بچانے کے لئے اگر کوئی کارآمد تدبیر ہے تو یہی کہ لوگوں کو بیج پیلنے اور تیل حاصل کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔ اس صورت میں ہندوستان کا تمام نفع ہندوستان ہی میں رہیگا۔ اور کھلی سے مویشیوں اور زمینوں کو زیادہ بہتر بنایا جاسکے گا۔ کم مزدوری اور زیادہ کھپت کی وجہ سے مال ہندوستانی تاجروں کو کبھی گراں نہ پڑیگا اور اس لئے انہیں ممالک غیر کے تجار سے مقابلہ کا خوف بھی نہ ہونا چاہئے ہندوستان ہی میں بیجوں سے تیل نکال لینے میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اعلےٰ قسم کے تمام تیل جو دوسرے ملکوں سے یہاں آتے ہیں یہیں بننے لگیں گے اور اس طرح جہاز وغیرہ کا جو صرفہ بیج بھیجنے اور پھر تیل منگانے پر ہوتا ہے بچ رہیگا۔

ہندوستان میں تیل نکالنے کے اس وقت جو طریقے رائج ہیں وہ بہت قدیم اور نقصان دہ ہیں۔ بالکل حال ہیں ملک کے بعض حصوں میں جدید مشین استعمال ہونے لگی ہیں۔ کولھو یا گھنی اب بھی ملک کے ہر حصہ میں موجود ہے۔ کولھو میں تیل نکالنے سے کھلی میں دس فیصدی سے لیکر تیس فیصدی تک تیل باقی رہ جاتا ہے۔ سائنٹفک تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رائی کی کھلی میں دس فیصدی سے سولہ فیصدی تک تیل رہ جاتا ہے۔ مہوہ کی کھلی میں پندرہ فیصدی سے بیس فیصدی تک اور رینڈی کی کھلی میں بیس فیصدی سے تیس فیصدی تک ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے جیسا کہ اوپر تبلایا جاچکا ہے وہ کھلی جسمیں تیل رہ جاتا ہے نہ مویشیوں کے کھلانے کے لئے زیادہ موزوں ہے اور نہ کھاد کے لئے۔

یورپ اور امریکہ میں اس وقت مختلف اقسام کی مشینیں اس کام میں مستعمل ہیں۔ یہی ہندوستان کے لئے بھی کارآمد ہوسکتی ہیں۔ یا اگر ضرورت ہو تو ان میں موقعہ و مقام کے لحاظ سے تھوڑا بہت تغیر و تبدل کرلیا جائے۔ ان مشینوں سے نقصان بالکل برائے نام رہ جائیگا

گورنمنٹ اور خصوصاً محکمۂ صنعت و حرفت کو ہندوستان میں یہ جدید ترین مشینیں رائج کرنی چاہئیں۔ تاکہ کولھو کے استعمال سے جو نقصان عظیم اس وقت ہو رہا ہے وہ ختم ہو جائے۔ کولھو اور ان جدید مشینوں کی قیمت اور اخراجات کا بغور مطالعہ کرنے سے فوراً معلوم ہو جائیگا کہ مشینیں صرف نفع اور آرام کے لحاظ سے ہی بہتر نہیں ہیں بلکہ ان کی قیمت اور اخراجات بھی قریب قریب وہی ہیں جو کولھو کے۔

ان تمام امور کو دیکھتے ہوئے جن کا ذکر بالتفصیل اوپر ہو چکا ہے یہ بات قطعی ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تیل کی تجارت کا مستقبل یقیناً شاندار ہے البتہ حکومت اور محکمۂ صنعت و حرفت کو اس جانب پوری توجہ کرنی چاہئے۔

(ماخوذ)

قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا

(از حضرت جگر مراد آبادی)

جنونِ عشق میں احساس اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا، دل درد سے لبریز ہو جاتا

یہ ساری لذتیں ہیں میرے شوق نامکمل تک
قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا

نہ رکھا دل کو احساسِ گنہ نے مستقل ورنہ
یہی ظلمت کدہ اک دن تجلی خیز ہو جاتا

(جناب فطرت کا شکریہ)

فقیر عزیز الدّین

(از مولانا عبدالستار فاروقی)

یہ باور کیا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کے شوق تحصیل علم و فضل میں بھی کمی آ گئی تھی۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد اسلامی تاریخ کسی ایسی ہستی کے پیش کرنے سے عاجز ہے جسے فضلاء زمانہ میں شمار کیا جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے سلطنت مغلیہ کے زوال کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے اس کا اقرار کرے گا کہ اس تباہی اور بربادی کے زمانہ میں بھی مسلمانوں میں ایسی باکمال ہستیاں موجود تھیں جن کے کارنامے علمی دنیا میں کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ ان باکمال ہستیوں میں بعض "مغلیہ تمدن کے مزار" یعنی دہلی میں موجود تھیں۔ اور بعض راجاؤں اور نوابوں کے درباروں میں ممتاز عہدوں پر فائز تھیں۔ چنانچہ اس پر آشوب زمانہ میں جبکہ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا فقیر عزیز الدین پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اپنی اسلامی خصوصیات (علم و فضل و کمال) کے ساتھ ایک ممتاز عہدہ پر متمکن تھے۔ آپ کا تعلق بخارا کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ آپ کے والد غلام محی الدین جو وسط ایشیا سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے تھے۔ ایک ماہر طبیب تھے۔ قیام لاہور کے زمانہ میں غلام محی الدین صاحب نے اپنے فرزند عزیز الدین کو وہاں کے ایک مشہور حکیم کی نگرانی میں دیدیا تھا جن کی وساطت سے ۱۷۹۹ء میں میاں عزیز الدین صاحب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری حکماء میں شامل ہو گئے تھے۔

فتح لاہور کے بعد مہاراجہ صاحب مرض آشوب چشم میں مبتلا ہوئے تو نوجوان حکیم کو اپنا کمال طبابت دکھانے کا موقعہ ملا۔ کہتے ہیں کہ حکیم عزیز الدین نے نہایت خوش اسلوبی اور انہماک سے علاج کیا۔ اور چند ہی دنوں میں مہاراجہ صاحب حکیم عزیز الدین کی اس خدمت سے بہت

ہی خوش ہوئے ۔ اور اس کے صلہ میں حکیم صاحب کو جاگیر عطا ہوئی ۔ اس واقعہ کے بعد سے حکیم صاحب مہاراجہ کی خاص عنایت کے مرکز ہو گئے تھے ۔ چنانچہ مہاراجہ صاحب کی وسعت ریاست کے ساتھ ساتھ آپ کی جاگیر اور دولت بھی بڑھتی رہی ۱۸۰۸ء میں فقیر عزیزالدین کو اپنی علمی لیاقت اور تدبر و فراست کے اظہار کا موقع ملا جبکہ سکھوں اور انگریزوں میں کشیدگی واقع ہو گئی تھی ۔ آپ نے کمال دانشمندی سے فریقین میں مصالحت کرا دی ۔ اس طرح مہاراجہ صاحب نہ صرف آپ کی طبابت و حکمت کا بلکہ تدبر و فراست کے بھی مداح ہو گئے تھے ۔ مہاراجہ اہم ترین امورات سلطنت میں آپ سے مشورہ لیتا اور ہر معاملہ میں آپ کی رائے کو مقدم رکھتا تھا ۔ یہاں یہ بتلانا بیجا نہ ہوگا کہ وہ آپ ہی کی شخصیت تھی جس کی وجہ سے مہاراجہ اور انگریزوں میں رشتۂ دوستی قائم رہا ۔ کیونکہ آپ کے انتقال کے بعد ہی صلح و آشتی کا زمانہ تباہی و خونریزی سے بدل گیا تھا ۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسی وقت سے مہاراجہ کی سلطنت کو گھن لگنا شروع ہوا ۔

آپ نے بڑی دیانت داری سے اپنے فرائض منصبی کو ادا کیا ۔ مہاراجہ کو بھی آپ پر پورا اعتماد تھا ۔ وہ اکثر اوقات سلطنت کو آپ کے سپرد کر کے جنگی مہموں میں شریک ہوتا تھا یا کبھی خود فقیر عزیزالدین کے زیر کمان فوج روانہ ہوتی تھی ۔ آپ کئی مرتبہ ایلچی بنا کر بھی بھیجے گئے ۔ ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ اور اسی سال امیر دوست محمد خان والیٔ افغانستان کے پاس آپ بطور ایلچی کے بھیجے گئے تھے ۔

آپ عادات و خصائل میں یگانۂ روزگار اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں بڑے مستعد تھے ۔ بے تعصبی اور آزاد خیالی آپ کا خاصہ تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مسلمان وزیر کی ایک کٹر سکھ راجہ کے دربار میں یہانتک عزت افزائی ہوئی کہ خود اس کے ہم مذہب بھی انگشت حیرت بدنداں ہو گئے بلکہ اکثر دلوں میں آتش رشک و حسد مشتعل ہو گئی تھی ۔

آپ سنی تھے یا شیعہ ؟ اس کا پتہ نہ چل سکا ۔ لیکن ذیل کی حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ فقیر منش اور صوفی مزاج تھے ۔ ایک مرتبہ راجہ نے دریافت کیا کہ آپ کو ان دو

ہیں کونسا مذہب پسند ہے۔ مسلمانوں کا مذہب پسند ہے یا ہندوؤں کا۔ آپ نے جواباً عرض کیا کہ "میں منجدھار میں بہ رہا ہوں اور خشکی کی طرف نظر کرتا ہوں تو دونوں ساحل برابر فاصلہ پر نظر آتے ہیں" مہاراجہ اس بات کو سن کر بہت خوش ہوا اور پھر کبھی آپ سے مذہبی گفتگو نہ کی۔

فقیر عزیزالدین اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے تقریر و تحریر میں ملکۂ خداداد حاصل تھا۔ سرکاری کاغذات اور یادداشتوں کو دیکھنے سے آپ کی علمیت کا پتہ چلتا ہے۔ سرلیپل گریفن کا قول ہے کہ "فقیر عزیزالدین علوم مشرقیہ کے زبردست ماہر تھے"۔

آپ ایک عمدہ شاعر تھے زبان صاف و شستہ تھی۔ اشعار بامحاورہ اور دلنشین ہوتے تھے۔ آپ کا علم صرف لٹریچر تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ ایک بڑے بلا سفر ماہر سیاست اور دبیر مملکت تھے۔ بیرن چارلس ہیوگل صاحب نے جو ۱۸۳۵-۳۶ء میں پنجاب کی سیاحت کر چکے ہیں فقیر عزیزالدین صاحب کی اعلیٰ قابلیت پر متبحرانہ ریمارک لکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسے زمانہ میں جبکہ درس و تدریس کی طرف کسی کو کوئی خاص توجہ نہ تھی اور خونریز ہنگامہ آرائیوں سے ملک میں ایک قیامت برپا تھی فقیر عزیزالدین ایسی جامع علوم و فنون ہستی کا مہاراجہ کے دربار میں پایا جانا سخت حیرت ناک تھا"۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ آپ سکھوں کی جانب سے سفارت کا کام بھی انجام دیتے تھے ۱۸۴۲ء میں آپ لارڈ النبرو کے پاس فیروزپور میں ایلچی ہو کر گئے۔ اور سکھ قوم کی اعلیٰ ترین نمائندگی کی جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ اسی موقعہ پر لارڈ مذکور نے بھی آپ کی تعریف کی اور حسن سفارت کے صلہ میں آپ کو "محافظ اتحاد برطانیہ اور سکھ" کا خطاب عطا کیا۔ اور لارڈ النبرو نے اپنی خاص طلائی گھڑی انعاماً عطا فرمائی۔ سرلیپل گریفن اپنی کتاب "رنجیت سنگھ" میں لکھتے ہیں کہ "میں اس گھڑی کو ان کے صاحبزادہ کے پاس مدت تک دیکھتا رہا۔ جو میرے لاہور میں سکریٹری تھے"۔ آپ نے اس دار فانی سے سکھوں کی پہلی لڑائی سے قبل ۱۸۴۵ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کے دو بھائی امان الدین اور نورالدین بھی مہاراجہ کے درباریوں میں تھے۔ اور بڑے شریف متقی و پرہیزگار تھے۔ لیکن زمانہ ان کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہے۔

پریم کی بانسری

افسانہ

(از جناب سرخوش زاہدی)

(ذیل کے فسانہ کا ایک خاص طرز بیان ہے خ-س)

(۱)

سیوک اپنے پانچوں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ باپ آخر دم تک اس کو سینہ سے لگائے رہا۔ اور چلتے چلاتے بڑے بھائیوں کو سونپ گیا۔ سب کے سب سیدھے سادے بھلے مانس تھے۔ سیوک کی بڑی محنت اور محبت سے سیوا کی۔ برادری کے دستور کے موافق ۹ برس کی عمر میں پاس کے ایک گاؤں میں اس کا بیاہ کر دیا۔ اور بے فکری سے گھومنے اور کھیلنے کے لئے اسے آزاد کر دیا۔

سیوک کو بچپن سے گانے کا بڑا شوق تھا۔ پتلے سے بانس کی ایک خوبصورت بانسری اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی۔ اسے وہ گاؤں کے کنارے کھیتوں میں بجاتا پھرتا۔ کوئی گانے والا سادھو گاؤں میں ستار لیکر آ جاتا تو سیوک اس کی خدمت گذاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ اسے اپنے گھر لیجاتا کھلاتا پلاتا آرام پہونچاتا۔ خدمت کرتا اور بھجن۔ ٹھمری دادرا گوا کر سنتا۔ اس کے بھائی اور بھاوج اس کی حرکت کو محبت کی نظر سے دیکھتے اور ڈر کے مارے کبھی کچھ نہ کہتے۔ جب سادھو جانے لگتا تو سیوک اسے بہت دور تک پہونچانے جاتا۔ ایک دفعہ ایک بہت بڈھا سادھو آیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس کی بڑی عزت کی اور سیوک سے اس کے گانے کی بہت تعریف کی۔ سیوک نے اسے ایک اٹھوارے تک اپنے یہاں مہمان رکھا۔ رات رات بھر چلم چڑھا چڑھا کر پلائی پاؤں دبائے اور بہت خدمت کی۔ لوگ اس کی محنت کو حیرت سے دیکھتے۔ پڑوس کی نوعمر لڑکیاں اس کا مذاق اڑاتیں اور کہتیں "سیوک! اس بڈھے فقیر کی سیوا سے تمہیں کیا مل جائیگا؟" لیکن سیوک،

مسکرا کر چپ ہو جاتا اور ان کے طعنوں کی کچھ پرواہ نہ کرتا۔

سادھو جانے لگا تو سیوک نے اپنی بانسری اٹھائی اور اسے پہونچانے کے لئے چلا۔ گاؤں کے لوگوں نے شام کے وقت اسے گاؤں کے باہر جاتے دیکھا۔ لیکن پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بہتیرا ڈھونڈ گیا لیکن اس کا کچھ کھوج نہ ملا۔ آس پاس کے گاؤں والے جو اسے پہچانتے تھے بس اتنا جانتے تھے کہ وہ سادھو کے ساتھ ادھر آیا تھا۔ لیکن پھر وہ کہاں گیا یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا اس کی سسرال والوں نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ پوچھنے پر اس نے ہاتھ کے اشارے سے وٹ کر آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر اس کی بانسری کی آواز نہ سنائی دی اور نہ وہ لوٹ کر آیا۔

سیوک کے چلے جانے سے گاؤں سونا سا ہو گیا تھا۔ ہر جگہ لوگ یہی چرچا کرتے تھے۔ ہر شخص کو اس کے غائب ہو جانے کا رنج تھا۔ گاؤں کے کنوئیں پر جب گاؤں کی ہر عمر کی عورتیں اور لڑکیاں پانی بھرنے کے لئے جمع ہوتیں تو سیوک کا ذکر کرتیں۔ اس کی بانسری کو یاد کرتیں اور بہت تعریفیں کرتیں۔

سیوک کے بھائیوں نے رنج کے مارے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی اور کسی دوسری جگہ چلے جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس کی سسرال کے لوگوں کو بھی اس کے گم ہو جانے کا بیحد غم تھا لیکن سیوک کی کم عمر دھرم پتنی اپارنا ان تمام واقعات سے بالکل بے خبر تھی۔ اپارنا نہایت بھولی لڑکی تھی۔ وہ اپنی بڈھی ماں کو چاچی اور چھوٹے بھائی نارائن کو نارو کہتی۔ اور گاؤں کے سب لوگ اسے آپو کہتے تھے۔ نارو آپو کی زندگی کا سہارا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھیل کود کر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتی۔ دنیا کی فکروں سے اسے کوئی غرض نہ تھی۔

(۲)

سات برس بیت گئے۔ سیوک کا کچھ پتہ نہ چلا۔ لوگوں کے دلوں سے اس کی یاد فراموش ہوتی جاتی تھی۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا میں زندہ اور سلامت نہیں ہے۔ بھائیوں نے اپنے دھرم کے مطابق اس کا دان پن بھی کر دیا۔ رشتے ناتے کے لوگ رو دھو کر صبر کر کے

بیٹھ رہے۔ سسرال والوں نے بھی اس کے کریا کرم میں کوئی کمی نہ کی۔ لیکن آپارنا جوان ہو چکی تھی۔ ماں باپ کو دوسرے کام کی فکر ہوئی۔ سیوک کے بھائیوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی۔ لیکن آپارنا کی اٹھتی جوانی دیکھ کر انہوں نے اسے زیادہ دن تک بٹھا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور چار و ناچار کہلا بھیجا بھائی! ایشور کی مرضی میں کسی کا اجارہ نہیں ہماری قسمت ہی ایسی پھوٹی تھی۔ نہیں تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ آخر آپو کو بٹھا رکھنے سے کیا فائدہ؟

اپارنا کو ایک ایک بات کی خبر پہونچتی رہتی تھی۔ آئندہ زندگی کا خیال کرکے اس کا جی بھر آتا تھا۔ سیوک کے علاوہ کسی دوسرے کی ہو رہنے کے خیال سے وہ کانپ اٹھتی۔ وہ اسے ایک بہت بڑا گناہ سمجھتی تھی کیونکہ اسے سیوک کے مرنے کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ جب نارو بچپن کے انداز میں بھولے پن سے سیوک کی موت کا ذکر کرتا۔ تو آپو فوراً بول اٹھتی "نہیں نارو! وہ سرگ باسی نہیں ہیں۔ وہ رو زرات کو ان کھیتوں میں ٹہلنے آتے ہیں۔ میں ان کی بانسری کی سریلی آواز برابر سنتی ہوں"! نارو اپنی بہن کی یہ عجیب باتیں سنکر چپ ہو جاتا۔

کام کی بات چیت شروع ہوگئی۔ رشتہ کا ایک لڑکا تلاش کیا گیا اور بیاہ کی طیاریاں ہونے لگیں۔ آپو سے نہ رہا گیا۔ دوپہر کے وقت ماں کے پاس گئی اور بیاہ سے انکار کر دیا۔ سب نے سمجھایا مگر وہ راضی نہ ہوئی برابر کہے جاتی "میں تو ان کی بانسری کی آواز سنتی ہوں" برہمنوں نے اس کا روگ پہچانا اور اسے "تربینی" میں اشنان کے لئے لے جانے کی صلاح دی۔ آپو کے ماں باپ بیٹی کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ برہمنوں کی رائے پر عمل کرنے کو طیار ہو گئے۔

(۳)

الہ آباد میں جمنا ندی کے ساتھ ساتھ ایک پرانی اور سنسان سڑک بھی چلی گئی ہے۔ کسی زمانہ میں اس پر مسافروں کا تانتا بندھا رہتا تھا اب بھی اکا دکا آدمی لبڑر بیا بھیس میں کمبل یا کپڑے کی چھوٹی موٹی گٹھری بانس کی لمبی لاٹھی کے سرے پر لٹکا کے کندھے پر

رکھے آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن دور دور کے پردیسی سرکنڈوں کے چھپرسے چھائی ہوئی بیل گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے۔ چلم پر دم لگاتے یا برہا۔ پچیڑا۔ کجلی وغیرہ کے تان لگاتے ہوئے بہت کم گذرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی تیرتھیوں اور جاتریوں کا کوئی جھنڈ پیدل یا گاڑیوں پر گذرتا ہے تو دھول دھکڑ اور شوروغل سے تھوڑی دیر کے لئے سماں بدل جاتا ہے۔

ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ میں سفید سفید سڑک ایسی معلوم ہو رہی ہے جیسے بالوں کے درمیان مانگ۔ جیٹھ کی چلچلاتی دھوپ میں ایک گھوڑا گاڑی گرد و غبار اڑاتی چلی جا رہی ہے اس کی کھڑکھڑاہٹ سے آس پاس کے جانور بھڑک جاتے ہیں۔ گاڑی کے اندر ایک بچہ اور پانچ چھ عورتیں ہیں۔ کوچوان کے برابر ایک بڈھا آدمی بیٹھا ہوا ہے اور ایک ہندوستانی رہبر چھت پر ہے۔ یہ رہبر تمام راستہ ہندی اور بنگالی ملی جلی زبان میں ادھر اُدھر کی باتیں چھیڑے رہا۔ لیکن بڈھا اس کی طرف بہت کم کان دھرتا ہے۔ گاڑی کے اندر کی عورتیں کبھی چپ نہیں رہتیں۔

"کیوں بیٹی! کیسی سندر جگہ ہے؟ تیرا من کیا کہتا ہے؟" "ہاں چاچی! بہت سندر ہے مجھے سب سندر معلوم ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ ان کھیتوں میں دھیرے دھیرے ٹہلوں"۔

"ارے بوکھل! کیسی باتیں کرتی ہے اس انجان جگہ میں یہ بھی کوئی آرزو ہے؟"۔

"ہاں چاچی! سچ ہے۔ لوگ اپنی کرتوں کا دھیان رکھتے ہیں۔ لیکن اچھاؤں (آرزوؤں) کی پرواہ نہیں کرتے۔ لیکن کیا اس وقت تمہارا جی نہیں چاہتا کہ اس گاڑی سے اتر کر تھوڑی دیر ٹھنڈی ہوا کھاؤ"۔

"آہ بیٹی! اس بڑھاپے میں یہ امنگ کہاں؟"۔

اپارنا کی ماں چپ ہو رہی تھوڑی دیر آپ اور نا رو بھی خاموش رہے۔ پھر آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ اپارنا کی ماں ان کی باتوں سے عاجز آگئی تھی اسنے کہا۔

"اچھا نارو اب چپ رہو! تم دونوں بھائی بہن ایک جیسے ہو کبھی ایک منٹ نچلے نہیں بیٹھتے۔" آپو نے ہنسکر جواب دیا۔

"دیکھو اسی لئے میں پہلے سے کہتی تھی کہ تم الگ جاؤ اشنان کرآؤ پھر ہم لوگ جائینگے" بڈھی ماں نے مُنہ بگاڑ کر کہا۔

"ہاں! کیوں نہ کہوگی؟ دولت پانی میں پھینکنے کے لئے نہیں ہوتی بیٹیا! دو مرتبہ گاڑی کا کرایہ دینے سے کیا فائدہ تھا؟"

اپارنا چپ ہو گئی۔ لیکن نارو کی زبان کون بند کرسکتا تھا؟ اتنے میں گاڑی بالکل رک گئی اور اپارنا نے آہستہ کہا "معلوم ہوتا ہے ہم پہونچ گئے۔"

بڈھا رہنما گاڑی کی چھت سے جلد جلد اترا اور دروازہ کھول کر اندر کے لوگوں سے جلد اترنے کی تاکید کرنے لگا۔ نارو اپنی شرارت سے کب باز آنیوالا تھا۔ جلدی میں کودا تو پیر دھوتی میں اٹک گیا اور وہ زمین پر آرہا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہاں کا خاموش سماں اس کی چیخ اور بوڑھی ماں کی جھڑکیوں سے ہنگامہ میں تبدیل ہو گیا۔ آخر بڈھے رہنما نے انہیں سمجھا بجھا کر چپ کیا۔

دریا کے کنارے پہونچنے کے لئے راستہ کسی قدر ڈھالو تھا۔ اپارنا نے نارو کا ہاتھ پکڑ کر کہا اب تمہیں کودنے پھاندنے کی ضرورت نہیں میرا ہاتھ پکڑ کر سیدھے چلے چلو اب لڑھکوگے تو پانی میں جاؤگے۔

نارو کو کافی سزا مل چکی تھی۔ اس لئے اب وہ بالکل خاموش تھا۔ بڈھی ماں کے ایک ہاتھ میں پیتل کا ایک چمکدار برتن تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی سلک کی ساری کی شکنوں کو پکڑے ہوئے تھی اس طرح وہ نہایت سنبھل سنبھل کر پیر رکھتی ہوئی چلی۔ اپارنا نے اپنی سنہری کنارے کی ساری کے آنچل کو مُنہ پر گھونگھٹ بنا کر ڈال لیا تھا۔ اور وہ اپنی ماں سے چند قدم آگے آگے تھی۔ بقیہ عورتیں اپنی اپنی ساری پکڑے اور اپنے اپنے برتن

لئے ہوئے آرہی تھیں۔

دریا کے کنارے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اپارنا کو بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں ایک چھوٹا خوبصورت مندر تھا۔ رہنما نے مندر کی طرف اشارہ کرکے کہا "بائی جی! یہ اچھاؤں (آرزوؤں) کے دیوتا کا مندر ہے۔ بہت طاقت والے دیوتا ہیں۔ تم یہاں جو کچھ مانگو ضرور ملے گا"۔

اپارنا یہ سنکر تھوڑی دیر حیران کھڑی رہی پھر آہستہ مندر میں داخل ہوئی۔ دیوتا کے سامنے تھوڑی دیر کچھ پڑھ کر جلدی سے واپس چلی آئی اتنے میں اس کی بوڑھی ماں جو کسی قدر پیچھے تھی پہونچی اور نہایت شوق سے مندر میں داخل ہوئی۔ دیوتا کے سامنے سجدہ کیا اور بہت گڑگڑا کر کہا "مہاراج! میری بیٹی شادی کرنے کو راضی ہو جائے تو میں آپ کی سیوا کرونگی"۔ باقی عورتوں نے بھی اسی طرح دعائیں کیں۔

اپارنا اس عرصہ میں پیپل کے سایہ میں کھڑی رہی۔ مندر سے نکل کر یہ پوری پارٹی گھاٹ کی طرف بڑھی۔ کشتی تک پہونچنے کے لئے تھوڑی دور کیچڑ میں چلنا چاہیئے تھا۔ ناروَ نے چلاکر کہا "میں اپنے جوتے اتار دیتا ہوں! لیکن اتار کر کہاں رکھوں" اس کی بہن نے جواب دیا "ارے نالائق! تب تو نے گاڑی ہی میں کیوں نہ رکھدیا تھا"۔ بڈھی ماں یہ سنکر بولی! "ہاں کیوں نہیں؟ تاکہ وہ چوری جاتے! اپارنا تجھ میں ناروَ سے زیادہ لڑکپن ہے بھلا گاڑی والے کا کیا اعتبار؟"

گاڑی والے کو کرایہ نہیں ادا کیا گیا تھا وہ اس کے بدلے میں ناروَ کے پرانے ٹوٹے ہوئے جوتے لیکر کیا کرتا؟ لیکن اپارنا نے ماں کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور صرف یہ کہا "اچھا اتار دو! میں لیتی چلتی ہوں"۔

بڈھے رہنما نے ایک کشتی ٹھیک کرلی تھی ایک ایک کرکے سب اس پر سوار ہوئے ملاح نے ان کو بیٹھنے وغیرہ کے متعلق چند ضروری ہدایات دیں اور روانہ ہوا۔ دریا کے

بیچ میں پہونچکر گرمی کا اثر بالکل زائل ہوگیا۔ ہر شخص اطمینان کا سانس لینے لگا۔ اپارنا کے سر سے آنچل سرک گیا۔ لیکن اسے اس کی کوئی اطلاع نہیں ہوئی۔ اس کی نگاہیں پانی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ لہروں کا راگ سننے میں محو تھی۔ دریا میں ہزاروں کشتیاں ادھر اُدھر آجا رہی تھیں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ موجود تھے۔ کسی کشتی سے لڑنے جھگڑنے کی آواز آرہی تھی۔ کسی سے گانے بجانے کی اور کسی سے ہنسی مذاق کی۔ اپارنا کو یہ سب چیزیں بہت انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔

تھوڑی دیر میں کشتی تربینی پر پہونچی۔ جہاں گنگا۔ جمنا اور سرسوتی کا سنگم ہے یہاں جاتریوں کی اتنی کثرت تھی کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ کنارے کے پاس پانی بالکل گدلا ہوگیا تھا لیکن لوگ اسی میں نہا رہے تھے۔ گویا وہ دریا کی وسعت سے بالکل بے خبر ہیں۔ لوگ دریا میں پھول اور دودھ لا لا کر ڈالتے تھے۔

سب عورتیں اشنان کے لئے اتریں لیکن اپارنا نے پہلے ہی سے نہ نہانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چنانچہ باوجود اصرار کے وہ نارو کے ساتھ کشتی ہی میں بیٹھی رہی نارو پانی سے کھیلنے میں مشغول تھا اور اپارنا گھاٹ کے تماشے دیکھ رہی تھی۔ نہانے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی جن میں اکثر بوڑھی عورتیں تھیں۔ کچھ جوان عورتیں بھی نہا رہی تھیں جنہیں تمام لوگ گھور رہے تھے۔ پنڈے منتر جنتر پڑھنے اور دولت کمانے میں مشغول تھے۔ کچھ نائی بیٹھے ہوئے نہایت تیزی سے اپنا کام کر رہے تھے۔

اتنے میں ایک سنیاسی ایک کشتی میں کالی کی مورت رکھے ہوئے گھنٹی بجاتا ہوا آیا نارو نے کہا "بہن دیکھو! کتنی اچھی مورت ہے؟" اپارنا کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک شخص گیروا لباس پہنے بانسری بجاتا ہوا آیا اور مورت کے گرد چکر لگانے لگا۔ بانسری کی سریلی آواز کے ساتھ اپارنا کھو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس ترنم کے نشیب

و فراز کے ساتھ اس کی روح گھوم رہی ہے۔

اپارنا نے جلد وارفتگی میں مورت کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے قریب تھا کہ بے دم ہو کر وہ پانی میں گر جائے کہ بانسری والے نے اسے پکڑ لیا۔ نارو زور سے چیخا لوگ جمع ہو گئے .... اپارنا ہوش میں آئی تو سیوک کی گود میں تھی۔ دوسرے روز پوری پارٹی سیوک کو ساتھ لیکر واپس ہوئی۔

جذبات فخر

(جناب فخرؔ)

خزاں سے پہلے ہی گلشن کی ہوگی پامالی　　جو مات کھا گیا گلچیں سے باغ کا مالی

کوئی طلسم تھا جادو تھا چشم ساقی میں　　کہ اک نگاہ میں دامانِ ہوش تھے خالی

چمن اُجاڑ ہوا بلبلیں تباہ ہوئیں　　سسک رہا ہے کہیں غم سے باغ کا مالی

نہ پوچھ عہد خزاں میں چمن کی آرائش　　کہ رنگ لائی ہے بلبل کے خون کی لالی

جنہیں تھی طاقتِ پرواز بام پر پہونچے　　شکست دیگئی فخرؔ اپنی بے پرو بالی

جلوہ نظر آتا ہے

جناب اصغر گونڈوی کی غزل اس زمین میں مشہور ہوئی۔ اس پر لکھنؤ میں مشاعرہ ہوا اور اسی طرح میں لکھنؤ اور لکھنؤ سے باہر کے شعراء نے طبع آزمائی کی۔ لکھنؤ کے مشاعرہ کی غزلیں رسالہ "مرقع" (لکھنؤ) کے کئی نمبروں میں شائع ہوئی ہیں۔ ۶ر نومبر کو اسی طرح میں ایک مشاعرہ حیدر آباد میں ہوا۔ میں اپنی غزل کے کچھ اشعار جو اس مشاعرہ کے لئے لکھے گئے تھے آپ کے رسالہ کیلئے بھیجتا ہوں۔ (وحید الدین سلیم۔ حیدر آباد دکن)

کس سمتِ تجلّی کا جلوہ نظر آتا ہے! — جو نقش خودی کا ہے دھندلا نظر آتا ہے

اس در پہ جبیں سائی بے سود ہوئی اے دل — اب نقش تمنّا بھی مٹتا نظر آتا ہے!

یہ کس کو ڈبویا ہے چڑھتی ہوئی موجوں نے — گرداب کا چہرہ بھی اترا نظر آتا ہے!

جب دیکھتا ہوں دل کی افسردہ امنگوں کو — اجڑی ہوئی دنیا کا نقشہ نظر آتا ہے

وہ نور جو دیکھا تھا بینائی آدم نے — پردہ سے مرے دل کے چھنتا نظر آتا ہے

دل جس کو تمنائیں رکھتی تھیں کبھی ٹھنڈا — شعلوں کے تلاطم میں ڈوبا نظر آتا ہے

جو مہر درخشاں ہے عالم کی نگاہوں میں — اس حسن کے پہلو میں سایہ نظر آتا ہے

تخییل مری بچکر تجھ سے نہیں جا سکتی — ناکوں پہ مرے دل کے پہرا نظر آتا ہے

اب دل کے سفینے کو گرداب مبارک ہو — پھر حسن کا وہ دریا امڈا نظر آتا ہے

شوخی ہے کن آنکھوں کی یہ جسکے سبب ہر دم — بدلا ہوا دنیا کا نقشہ نظر آتا ہے

آنچل ہے الٹنے کو کس شوخ کی رعنائی — گلشن کا ورق سارا الٹا نظر آتا ہے

ڈالا تھا کبھی پرتو جو تو نے تغافل سے — اب طور کے سانچے میں ڈھلتا نظر آتا ہے

تھی خاک میں ملنے کو سب نشو و نما جس کی — وہ تخم تمنّا پھر اگتا نظر آتا ہے!

ہر دانہ کو میں جس کے پلکوں سے اٹھاتا تھا
پھولوں کو ہے جا پکڑا اے دزدِ خزاں تو نے
اے تیغِ حوادث میں صدقے تری چوٹوں کے
ساحل سے مرے ہٹ جا اے ظلمتِ بینائی
اے کاوشِ بیتابی مت چھیڑ مرے دل کو
میں خاک میں ملتا ہوں دیکھو تو مگر مجھ کو
جو صنعتیں اس کی تھیں سب اُس نے مٹا ڈالیں
یہ حسن کی زیبائی واللہ عجب شے ہے
فانوس مرے دل کا تھا رشکِ چمن جس سے
ہوتی نہیں مل سکتے۔ تہ تا نہ اگر ہو بچے
دامن تری الفت کا دل تھام سکے کیونکر
درکار ہے اک میداں جولانیٔ وحشت کو

وہ خرمنِ ایماں اب جلتا نظر آتا ہے!
اب قافلہ رنگوں کا لٹتا نظر آتا ہے
ہر زخم مرے دل کا ہنستا نظر آتا ہے
سیلابِ تجلّی اب بڑھتا نظر آتا ہے
قطرہ میں مجھے دریا سوتا نظر آتا ہے
بربادیٔ عالم کا خاکا نظر آتا ہے!
اب صانعِ عالم خود تنہا نظر آتا ہے
ملبوسِ خدائی میں بندہ نظر آتا ہے
وہ شعلۂ رنگیں اب بجھتا نظر آتا ہے
دریائے حیات اے دل گہرا نظر آتا ہے
ہاتھوں میں تمنّا کے رعشہ نظر آتا ہے
انجم سے پرے مجھ کو صحرا نظر آتا ہے

"ادبستان" کے لئے ہر شہر میں محنتی اور دیانتدار
ایجنٹوں کی ضرورت ہے

میں کسی سے شادی نہیں کرونگی

(فطرت - اقبال)

اس مجمع میں بہت سے آدمی تھے - ان میں کسی نے مجھ سے شادی کی درخواست نہ کی میری بعض بہنیں شاید یہ رائے قائم کرنے میں، جلد بازی سے کام لینگی کہ "میری اس میں سبکی ہوئی" لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے - ہمیں اس قدر تنگ خیال نہیں ہونا چاہیئے - بات دراصل یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی مجھ سے شادی کی درخواست کرتا بھی تو میں اسے منظور نہ کرتی -

میری ایک دوست کا ذکر ہے اس کے خاندانی حالات اسے زیادہ میل جول اور سوسائٹی میں آنے کا موقعہ نہیں دیسکتے تھے - تعین شوہر یا انتخاب رفیق کے موقع کو اس نے استعمال تو کیا لیکن چونکہ وہ عام حالات اور مردوں کے فوری جذبات میں سے پختہ اور خام کی تمیز نہیں کرسکتی تھی اس لئے اس نے بہت جلدی کی اور محض معمولی اظہار خلوص اور اقرار و وفا کے وعدوں پر اپنے دل کی پوری کائنات کو بیچ بیٹھی - چند دنوں کے بعد مجھے اس سے ملنے کا موقعہ ملا - وہ بظاہر تو بڑی خوش اور اپنے آپ کو مطمئن ظاہر کرتی تھی مگر مجھے فوراً معلوم ہوگیا کہ اس کو رفیق زندگی کے انتخاب میں غلطی ہوئی اور اب وہ اپنی جلد بازی اور ناتجربہ کاری کے مارے نہایت تکلیف دہ حالات کا مقابلہ کر رہی ہے -

میں اس کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتی کیونکہ میرے پاس ٹھوس اور مفید باتوں کی کمی نہیں ہے - اگر مجھے وقت ہوتا تو میں اس کی تفصیل کو دلچسپ الفاظ میں ادا کرتی اور نادار یا غریب ہوتی تو اس کے ذریعہ کسی پبلشر کمپنی سے کچھ معاوضہ بھی حاصل کرلیتی - مگر میں خوش ہوں کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور میں کھانے پینے اور ضروریات زندگی بھر کا خود کمالیتی ہوں - اس لئے صرف ضرورت بھر واقعہ کی طرف اشارہ کردینا کافی سمجھتی ہوں -

میں اپنی بہنوں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہ شادی کے معاملہ میں جلدی نہ کیا کریں شادی

کوئی ایسا معمولی کام نہیں ہے کہ سوچ بچار کئے بغیر کر لی جائے۔ شادی اگر سوچ سمجھ کر کی جائے تو دوامی خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہی شادی اگر بے سوچے سمجھے کی جائے تو عمر بھر تکلیف اور بدمزگی کا سامنا رہتا ہے۔ میرے خیال میں شادی کرتے وقت حسب ذیل امور کو مدنظر رکھنا میری بہت سی بہنوں کو تکلیف سے بچا سکتا ہے :۔

۱۔ میں فضول خرچ آدمی کو پسند نہیں کرتی۔ اس لئے کہ فضول خرچ آدمی آزادی اور فیاضی کو بدنام کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ وقت اور ضرورت پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اس کی عادت بھی اس کو اس قابل نہیں ہونے دیتی کہ وہ طرح طرح کی ضروریات میں سے ضروری اور غیر ضروری کی تمیز کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی معمولی اور غیر ضروری کاموں اور چیزوں میں پانی کی طرح بہا دیتا ہے اور بڑے بڑے کاموں کے لئے دوسروں کا منہ تکتا ہے۔

۲۔ کنجوس آدمی سے بھی مجھے سخت نفرت ہے۔ کنجوس آدمی کس طرح پہچانا جاتا ہے؟ یہ بہت ضروری سوال ہے۔ کنجوس آدمی اوّل تو اپنی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے ہر وقت تجارتی گفتگو کرتا ہے۔ اور آپ اس سے سوال کریں یا نہیں، کوئی تذکرہ ہو یا نہ ہو، وہ خود بخود ایک بحث پیدا کر کے اس میں توجیہ اور تاویل کرنے لگتا ہے۔ اسے اپنی گفتگو پر اس درجہ معقولیت اور ضروری ہونے کا یقین ہوتا ہے کہ اُسے مخاطب کے اکتا جانے کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ وہ بلا ضرورت اپنی آمدنی کے ذرائع بتانے لگتا ہے جس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کی امارت میں شک نہ کریں۔ اسے اس گفتگو اور اپنی تعریف پر مخاطب کی بدظنی کا بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ بدظن نہ ہو جائے۔ لیکن پھر بھی وہ اس طرح شیخی مارتا ہے کہ اس میں کسر نفسی کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ گویا آپ کو اچھا خاصہ کودن سمجھتا ہے۔

غریب اور مستحق امداد لوگ تو ایک طرف رہے وہ اپنی خادمہ کو بھی کبھی کبھار ایک دمڑی تک دینے کی غلطی نہیں کرتا۔ برسات کے موسم میں، جبکہ ایک محدود آمدنی کے میاں

بیوی بھی، اور کچھ نہیں تو کرایہ ہی کی گاڑی پر آتے جاتے ہیں، وہ ایک آدھ میل نہیں، بلکہ دو دو تین تین میل تک آپ کو پیدل لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ پیدل چلنا وقت ضائع کرنا اور پتلون اور بوٹ کو خراب کرکے دھوبی اور خادموں کی مشکلات میں اضافہ کرنے میں نہیں جھجکتا، لیکن اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ چند آنے خرچ کرکے آرام سے اور وقت پر اپنا کاروبار انجام دے!

غالباً میری بہنوں کو، ایسے شخص کو بدترین رفیق حیات قرار دیدینے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔ جو ہر وقت اپنی بیکار دولت اور غیر مفید کاروبار کا تذکرہ کرتا رہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی موضوع گفتگو ہی نہ ہو۔ لطف اور مسرت تو برطرف، ایسا شخص اپنے کاروبار کی مشکلات اور تجارتی نقصانات کا ذکر چھیڑ چھیڑ کر آپ کے تمام خیالات کو پراگندہ کردیگا!

یہ ضرور ہے کہ جس شخص کو اپنے کاروبار کا اندیشہ لگا رہتا ہے، وہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ لیکن ہمدردی کے معنی اس قدر وسیع کیوں لئے جائیں کہ اس کی خاطر کوئی اور شخص اپنا تمام وقت غم، فکر، اور بے چینی کی نذر کردے؟ ایسا شخص اگر غربت اور ناداری کی مشکلات کا مقابلہ کرتے کرتے موجودہ خوش حالی تک پہونچا ہے تو اس صورت میں اس کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ پھر غریب اور نادار نہ ہو جائے۔

۴ - وہمی اور شکی مزاج کے انسان سے بھی خدا بچائے۔ وہمی آدمی گاڑی کے اصل وقت سے ایک آدھ گھنٹہ پیشتر ہی سے آپ کو اسٹیشن پر گھسیٹ لے جاتا ہے۔ اور پھر بھی اسے ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں دیر نہ ہو گئی ہو۔ اگر اتفاق سے آپ کے ہاتھ یا پاؤں پر کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو وہمی آدمی اس کو مرض الموت سے کم نہیں سمجھتا۔ وہ اس کے علاج کے لئے بلا ضرورت اس درجہ بے چین اور متفکر ہوتا ہے کہ تمام کاروبار کا پروگرام بدل جاتا ہے۔ اس کی بے جا فکر اور ضرورت سے زیادہ، غلط ہمدردی سے اس قدر کوفت

ہونے لگتی ہے کہ اصل تکلیف کا برداشت کر لینا اس کے مقابل آسان ہوتا ہے۔ اور پھوڑے پھنسی کی تکلیف سے اس کی پروا اور توجہ، زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے!

اگر اتفاق سے آپ کو کہیں چوٹ آگئی تو وہ سمجھتا ہے کہ اب آپ کا سلامت بچ رہنا مشکل ہے۔ اس چوٹ کو وہ ایک مہلک اور خطرناک بیماری سے کم نہیں سمجھتا۔ اور ہر وقت اس ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے کہ آپ جس بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں اس سے کسی طرح نجات حاصل کی جائے!۔

فرض کیجئے، وہی آدمی کو کمرے میں ایک تصویر لٹکانی ہے تو اس کام کے لئے وہ اس قدر اہتمام کرتا ہے کہ دوسرے شخص کو اس کام پر واقعی عظیم الشان ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اس کام کی خاطر تمام محلہ والوں کو بلاتا ہے اور پھر بلا تمیز اہلیت ہر ایک سے تصویر لگانے کے متعلق سوال کرتا ہے۔

کسی سے کہتا ہے کہ یہ کتنی اونچی ہونی چاہئے؟ دوسرے سے کہتا ہے کہ یہ کہاں لگانی چاہئے؟ تیسرے سے پوچھتا ہے کہ یہ کس قدر جھکی ہوئی ہونی چاہئے؟ چوتھے سے نہایت منت سے کہتا ہے کہ تم ہتھوڑا پکڑے رہو۔ پانچویں سے کہتا ہے کہ آپ کو تکلیف تو ہوگی، معاف کرنا، ذرا اس تصویر کو اس طرح تھامے رہئے! چھٹے سے کہتا ہے کہ آپ اس کا خیال رکھئے گا کہ اس کی کیلیں ٹھیک ٹھیک اور مناسب فاصلہ پر ٹھکتی ہیں کہ نہیں! جب تصویر ان تمام نام نہاد اور طبع زاد مراحل کے بعد لٹک چکتی ہے تو پھر سب سے دریافت کرتا ہے کہ کہئے! تصویر ٹھیک لگی۔

۴۔ مغرور آدمی سے بھی میری جان جاتی ہے۔ ایسے شخص کو اپنی شکل و صورت پر اس درجہ گھمنڈ ہوتا ہے کہ معمولی پروا سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ ہر وقت اس کی پرستش کرتی رہیں، اور اپنی تعریف کے علاوہ کسی اور کا تذکرہ کرنا تو درکنار، سننا بھی نہیں چاہتا۔ اس کو اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ اس کے سامنے

کسی اور شخص کے کمالات کی تعریف کی جائے۔ ایسا شخص جب آپ سے شادی کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو آپ کا ممنون نہیں، بلکہ آپ کو اپنا ممنون سمجھتا ہے۔ وہ شادی نہیں کرتا گویا آپ پر احسان کرتا ہے! اس ساخت کے دماغ والا انسان بھی نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے میں بچتی ہوں اور اپنی بہنوں کو بچنے کی ہدایت کرتی ہوں۔

غزل

(مولانا کیفی چریاکوٹی)

سر بسر شکل تمنا ہے یہ اچھا درد ہے
میں سراپا دل ہوں دل میرا سراپا درد ہے

مل گئے الفت میں مجھکو دونوں عالم کے مزے
تم مری آنکھوں میں ہو دل میں تمہارا درد ہے

ہجر میں اک اک قدم کا نام ہے بیچارگی
تھام کر دل بیٹھ جاتا ہوں جو اٹھتا درد ہے

کیا بتاؤں چارہ گر میں آہ کس کا نام لوں
یہ دلِ بیتاب جس کا ہے یہ اس کا درد ہے

دم بخود اہل مداوا ہیں کریں تو کیا کریں
دل ٹھہرتا ہی نہیں دم بھر یہ کیسا درد ہے

بار میرے دل پہ ناصح صبر و تسکیں کا نہ رکھ
جسکو تو دانا سمجھتا ہے مداوا درد ہے

کس لئے بیٹھے ہوئے ہیں میری بالیں پر طبیب
میں ترا بیمار ہوں مجھکو انوکھا درد ہے

دم بخود رہنے نہیں پاتا کوئی پہلو مرا
سچ جو پوچھو زندگانی کا سہارا درد ہے

فتنۂ محشر بپا ہے کوئی سنتا ہی نہیں
ورنہ ہر نالے سے کیفی میرے پیدا درد ہے

کلام امیر

(از حضرت امیر بدایونی)

جنوں نالاں ہے جس مایوسیِ ظلمت فراواں کا
وہ اک دھندلا سا خاکہ ہے ہماری شام ہجراں کا

تسلی دام مانگے برق آتش دست بیتابی
اثر اتنا تو ہے داغ جگر میں سوز پنہاں کا

امید وصل سے حاصل نہیں جز ہجر و ناکامی
تمتع اب مرادف بن گیا ہے لفظ نقصاں کا

نہ ہو کیوں ہر در و دیوار کو امید ویرانی
کہ چارہ سیلِ طوفاں ریز پر ہے چشم گریاں کا

ہے جور و ظلم بے پایاں پئے نقد جان و دل حاضر
وفا نے مسئلہ حل کر دیا ہے جبر و نقصاں کا

وفور بیدلی سے پوچھ اس ناکام دہقاں سے
ثمر ار تشنہ جسکی کشت پر حاصل ہو باراں کا

کیا ہے جادۂ پیما مجھکو اس وادی میں وحشت نے
کہ جسمیں ضبط خاموشی طریقہ ہے حدیخواں کا

نہ ہو کیوں اس نگاہ تلخ سے لب کو شکر رنجی
شہید خنجر مژگاں پہ رکھا بار احساں کا

امیر اس تیغ بیدرماں سے ہیں جویائے غمخواری
لب یاس آفریں پر تذکرہ ہے جس کے درماں کا

نازنین جاسوس

ایک مسلسل ناول

(از مولانا فطرت انصاری ندوی)

باب اوّل

(گذشتہ سے پیوستہ)

"— اس کا انجام بہت بُرا ہوگا ۔ میں نے اس چُور کو پہچان لیا ہے جو تمہارے سامنے دور کھڑا ہے۔"

چارلس :۔ مجھے اس واقعہ کی اہمیت سے انکار نہیں ہے ۔ مجھے تو بظاہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ بات پہلے ہی سے طے شدہ تھی ۔ اور تم ایک شکار کی طرح اس کے ہاتھ لگ گئے ہو۔

افسر :۔ ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں ۔

چارلس :۔ یعنی !

افسر :۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہوا وہ تو آپنے دیکھ ہی لیا ۔ بات یہ ہے کہ میں امیرالبحر شرووڈر کے بیڑہ میں کپتان کے عہدہ پر ملازم ہوں ۔ مجھے لندن اس لئے بھیجا گیا ہے کہ میں مسٹر ماڈن اور مسٹر مکتر افسران اعلےٰ افواج اتحادی سے ملوں اور مذکورہ بالا افسروں کو لاسلکی تلغرات کے جدید طریقوں اور چند مخصوص اشارات (codewords) سے مطلع کروں۔ میں اس سے زیادہ آپ کو بتا بھی نہیں سکتا ۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کے جو اصطلاحات اس آلہ کے متعلق ایجاد ہوئے ہیں وہ سب لیکر میں یہاں آیا تھا اور ان میں بہت سے نقشے وغیرہ بھی شامل تھے ۔

چارلس :۔ میں سمجھ گیا — تو گویا آپنے انہیں کاغذات کو کھو دیا ہے!

افسر :۔ کھو دینے کا لفظ صحیح نہیں ہے ۔ بلکہ وہ ایک عجیب غریب طریقہ سے لئے گ[ئے]

ہیں ۔ اور مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا ۔

چارلس :۔ آپ اس رات کہاں گئے ؟

افسر :۔ شام کا کھانا کھانے کے لئے میں ایک ہوٹل میں گیا ۔ کھانا کھایا ۔ کھانا کھانے کے بعد ڈانس ہال میں چلا گیا اور لوگوں کو دیکھتا رہا ۔ وہاں فرانسیسی صلیب احمر کے لئے چندہ کی کارروائی بھی ہو رہی تھی ۔ میں اس کو دیکھتا رہا ۔ وہ کاغذات میرے ساتھ تھے ۔ مجھے خیال گذرا کہ خدانخواستہ کہیں یہ کاغذات گم نہ جائیں ۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ان کاغذات اور نقشہ جات کو نصف نصف کر لیا ۔ ان کا ایک ایک حصّہ تو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور باقی نصف ہوٹل ہی کے ایک آہنی صندوق میں بند کر کے رکھدئے ۔

چارلس ۔ کاغذات کو نصف نصف کاٹنے سے آپ کی کیا غرض تھی ؟

افسر :۔ یہ کاغذات کچھ اس ترکیب سے طیّار کئے گئے تھے کہ اگر ان کا ایک حصّہ نہ ہو تو دوسرا حصّہ بھی بیکار ہو جاتا ہے ۔

چارلس :۔ اچھا تو دوسرا حصّہ آپ کی جیب میں تھا ؟

افسر :۔ ہاں ، جیب میں ۔ میں جب ڈانس ہال میں داخل ہوا ہوں مجھے یاد ہے کہ اس وقت وہ کاغذات میرے جیب میں موجود تھے ـــــــ میں ڈانس دیکھتا رہا ۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ کاغذات غیر محسوس طریقہ سے میری جیب میں سے نکال لئے گئے ہیں ـــــــ ،

چارلس :۔ آپ ڈانس میں شریک ہوئے تھے ؟

افسر :۔ ہاں ، ہاں ڈانس میں میں دو ایک مرتبہ شریک ضرور ہوا ۔ لیکن میں لڑکیوں کے ساتھ میں شریک رقص ہوا ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس پر اس کا شک کیا جائے ـــــ ،

چارلس :- تو آخر وہ کاغذات کس نے چرائے ؟
افسر :- یہی تو ایک راز ہے ۔ میں بھی تو اس فکر میں ہوں کہ اس کا پتہ لگایا جائے ایک شخص میرے پیچھے پھرتا ہے ۔ جہاں میں جاتا وہ بھی وہیں پہونچتا ہے ۔ اس سے مجھے شک ہوا کہ مخالفین نے وہ کاغذات کسی نہ کسی طرح میری جیب سے نکال لئے ہیں اور اب وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح وہ ان کے نقشے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ——،
اس خیال کی تکذیب یا تصدیق کے لئے میں نے یہ کیا کہ اسی طرح کا ایک بنڈل باندھ کر جیب میں رکھ لیا کہ اگر یہ میرے پیچھے پیچھے پھرنے والا شخص واقعی چور ہے اور کاغذات کو ہی لے گیا ہے تو ان کے نقشے کے دھوکے میں وہ اس بنڈل کو حاصل کرنے کی کوشش ضرور کریگا ۔ اور اس طرح مجھے اس کے تعاقب اور پہلے کا غذات کی تفتیش کا موقع مل سکے گا ۔
چنانچہ آج ۔ یہ شخص میرے پیچھے لگا ۔ آدھی رات تک تو میں جاگتا رہا اور اس کو موقع نہیں مل سکا ۔ جب ۱۲ بج گئے تو میں اس کی آنکھ بچاکر ادھر دریا کے کنارے آگیا............
افسر :- (چارلس کا ہاتھ پکڑ کر) دیکھو، دیکھو، وہ دیکھو ۔ وہ شخص پھر کھڑا ہو گیا ہے —— اور کسی طرف جانا چاہتا ہے ! مہربانی فرماکر آپ مجھے اسی کے تعاقب میں مدد دیں ۔ ہو نہو، بھائی کوئی اور آدمی بھی اس کے ساتھ ضرور ہوگا ۔ میں اس کے پیچھے جاتا ہوں —— اور آپ یہ دیکھتے رہئے کہ دوسرا آدمی کدھر سے آتا ہے؟
چارلس ! آپ یقین کیجئے کہ اس طرح آپ صرف میری مدد نہیں کر رہے ہیں بلکہ وطن عزیز کے اہم ترین خدمت ادا کر رہے ہیں ۔
چارلس :- اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ شخص کسی غیر حکومت کا جاسوس ہے۔ اور نہایت اہتمام اور احتیاط سے اس کام کو انجام دیگا ۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے سراغ

لگانے کے لئے ہم کو یہ شہر چھوڑنا پڑے۔ میں اس میں ہر ممکن امداد دینے کو طیار ہوں، لیکن یہ سوچ لیجئے کہ یہ حوصلہ خالی از دقت نہیں ہے!

افسر:۔ اس کے سراغ لگانے کے سلسلے میں اگر مجھے دور دراز ملکوں میں بھی جانا پڑے تو میں اس کی پروا نہیں کروں گا۔ معاملہ کی نوعیت کو آپ سمجھ چکے ہیں اور میں مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے بالکل طیار ہوں کیونکہ میرے لئے ان مخفی کاغذات کا حاصل کرنا ازحد ضروری ہے! بہرحال، اس وقت اس بحث کو بڑھانا مطلب کو فوت کرنا ہے وقت بہت تنگ ہے اور مخالف ہمارے ہاتھ سے نکل جانا چاہتا ہے ــــ وہ دیکھیئے، اب وہ چلدیا ــ اچھا تو آپ اب ویسٹ منسٹر کی طرف سے جایئے اور وہاں سے شمال کی طرف جانیوالی سڑک لے لیجئے ـــ اور میں اسی کا تعاقب کرتا ہوں۔ جاتے وقت افسر نے چارلس کو ہدایت کی کہ:۔

"مسٹر چارلس! میں آپ کی ہمدردی اور احسان کا مشکور ہوں" "لیکن اسی کا خیال رہے کہ اگر میں اور آپ راستہ میں" "کسی ایسی جگہ ایک دوسرے سے ملیں جہاں یہ چور یا اور کوئی" "آدمی بھی قریب ہو، تو آپ مجھ سے بات چیت نہ کیجئے گا" "اور نہ ہی کوئی اور اسی قسم کی حرکت کیجئے گا جس سے میرے اور" "آپ کے درمیان کوئی آشناسائی معلوم ہو بلکہ اجنبیوں کی طرح" "مجھ سے الگ تھلگ رہیئے گا! اس اثنا میں اگر آپ کو کسی" "اور شخص کا یہ سراغ ملجائے یا وہ خود بخود آپکے سامنے" "سے گذرے تو آپ اس چور کا تعاقب چھوڑ دیجئے گا" "اسے میں دیکھ لوں گا۔ آپ اس نئے آدمی کے پیچھے" "ہو لیجئے گا۔ اور اس امر کا سراغ لگانے میں مصروف" "ہو جائیے گا ــــ"

باب (۲)

تعاقب

چارلس نے افسر کی ہر ایک ہدایت کو نہایت غور سے سنا اور ایک رضاکارانہ انداز سے سر تسلیم

ختم کر دیا۔ دونوں تعاقب کے لئے روانہ ہوئے۔ چور بھی کچھ فاصلہ پر ان آگے آگے جا رہا تھا ابھی یہ دونوں فلیر روڈ پر ہی پہونچے تھے کہ چور بیٹھ گیا اور دیا سلائی سے سگار سلگایا........

دیا سلائی کا سلگانا۔ جلتی ہوئی دیا سلائی کو پھینکنا۔ اور سگار کا ایک کش لیکر اس کا دھواں نکالنا۔ یہ تمام کام کچھ اس طرح اور ایسے انداز میں ہوئے کہ چارلس کو ان تمام حرکات پر اشارات کا شبہہ ہوا۔

چارلس کا شبہہ یقین سے بدل گیا کہ وہاں اس چور کے علاوہ بھی کوئی شخص موجود ہے جس کو اس نے اشارہ کیا ہے! اور بہت اغلب ہے کہ یہ اشارات ان میں پہلے ہی سے طے شدہ ہوں۔

نازنین جاسوس

چارلس نے دیکھا کہ سگار کے سلگتے ہی سڑک کے سامنے والے ہوٹل کا دروازہ کھلا۔ اور اس میں سے ایک عورت باہر نکلی جو سبز رنگ کی ریشمی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ خاتون کا لباس شاندار تھا اور اس کی ٹوپی نہایت قیمتی بیل بوٹوں سے سجی ہوئی تھی۔ کندھوں پر ایک مشہور اور اعلےٰ قسم کی چادر ڈالے ہوئے تھی جس کو عام طور پر ڈینلے (Danley) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ رات کو خواتین عموماً بھی چادر استعمال کرتی ہیں.......

یہ عورت ہوٹل سے نکلی اور تھوڑی دیر تک دروازہ کے سامنے ہی ٹھیری رہی۔ پہلے اس نے دائیں بائیں طرف دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ وہ موٹر یا کسی ٹیکسی کو دیکھتی ہے۔ ایک منٹ کے بعد وہ سامنے کی سڑک کو طے کر کے اس چور کے پاس سے، چپ چاپ، نہایت تیزی سے گذر گئی۔ کوئی بات چیت نہیں کی______،

اگرچہ بظاہر ان دونوں میں کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے پاس سے گذرتے وقت چارلس نے ایک ہاتھ کی حرکت کو ضرور محسوس کیا جسمیں کوئی سفید سفید چیز، ہو بہو اس سفید بنڈل کی طرح، ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہوئی ضرور دکھائی دی جس کو اس نے دریا کے کنارے افسر کے جیب سے نکلتے دیکھا تھا۔

یہ سب کچھ نہایت پھرتی سے عمل میں آیا اور چارلس کو اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ اس چور کے اور ساتھی بھی یہاں موجود ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ سگار کا سلگانا بھی ایک قسم کا پہلے سے طے شدہ اشارہ تھا۔ اور اب چارلس کو فوراً یہ خیال آیا کہ افسر کو ان واقعات کی اطلاع دے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ واپس جانے اور افسر کو تلاش کر کے اس سے یہ تمام ماجرا کہنے کے لئے پچھلے پاؤں الٹ جانے ہی کو تھا کہ اسے پھر افسر کی ہدایت یاد آئی جو چلتے وقت اس نے دی تھی۔

چارلس پھر انہی کے تاڑنے میں مصروف ہو گیا اور اس کو خلاف مصلحت سمجھا کہ ان دو آدمیوں کو چھوڑ کر افسر کی طرف جائے۔ افسر نے چلتے وقت چارلس سے یہ بھی کہا تھا کہ جب کوئی دوسرا آدمی اس سلسلہ میں نظر پڑے چور کو چھوڑ کر اسی کا تعاقب کیا جائے۔ چنانچہ اس نازنین جاسوس کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور اس کے پیچھے ہولیا۔

اب چارلس کو کسی قدر کامیابی کی جھلک جو نظر آئی تو اس کا دل بڑھ گیا اور پہلے سے بڑی مستعدی کے ساتھ اس اتفاقیہ مگر پراسرار کام میں دلچسپی لینے لگا ——

چور کا تو کہیں پتہ نہ ملتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاغذات کا بنڈل اس خاتون کے حوالہ کرتے ہی ان سے علیحدہ ہو گیا۔ خاتون نہایت تیزی سے راستہ طے کرنے لگی۔ چارلس بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ خاتون کا رُخ بیگا ڈے کی سمت کو تھا۔ اور وہ نہایت پھرتی سے جا رہی تھی کبھی یہ سڑک، کبھی وہ، ادھر اُدھر کے چکر ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ چارلس بھی اس کی آنکھ بچا بچا کر اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

چارلس کو سب سے زیادہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ یہ برق رفتار خاتون کہیں اس سے پہلے کسی ہوٹل یا مکان میں نہ گھس جائے اور پھر اس کا پتہ لگانا ہی دشوار ہو جائے۔ یا خدا نخواستہ وہ کسی ہجوم میں غائب ہو جائے اور اس کی یہ تمام دوڑ دھوپ بیکار ثابت ہو۔ چارلس کا یہ خدشہ اس وقت سے اور بھی بڑھ گیا جب سے خاتون نے دو ایک دفعہ جاتے جاتے

پیچھے مڑکر دیکھا۔ اس سے چارلس کو یقین ہوگیا کہ خاتون نے اسے دیکھ لیا ہے اور اس کے تعاقب کا اسے علم ہوگیا ہے۔ اب چارلس نے اس خاتون کے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جاتے جاتے سڑک کے کنارے کسی دروازہ کی آڑ لے کر چھپ جاتا تھا۔ اور چلتے چلتے جب اسے موقعہ ملتا کسی دیوار کے پیچھے تھوڑی دیر کے لئے چھپ رہتا تھا اس سے وہ اپنی بے تعلقی ظاہر کرتا جاتا تھا۔

چارلس کئی دفعہ چھپ چھپ گیا اور تیز رفتار خاتون نے اپنے شک کے مطابق پھر اسے پلٹ کر دیکھا تو چارلس اسے نظر نہ آیا اس سے وہ سمجھی کہ "میرا خیال غلط ہے، یہ شخص کہیں اور جا رہا تھا" الغرض خاتون کے دل سے اب چارلس کے تعاقب کا خیال جاتا رہا۔ لیکن واقعہ یہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ، چارلس اسی طرح ایک دیوار کی آڑ میں چھپ رہا۔ آڑ سے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ جاتے جاتے رک گئی ہے ـــــ،

(باقی باقی)

وارداتِ قلب

(از محمد صدیق مسلم مالیگانوی)

سب مجھے تکتے ہیں میرا دردِ پنہاں دیکھ کر
یعنی آنکھوں میں مری اشکوں کا طوفاں دیکھ کر

ہوتے ہوتے ہو گئے ہم اسقدر آبلہ طلب
تلوے کھجلاتے ہیں اب خارِ مغیلاں دیکھ کر

یہ حیاتِ مختصر اور اس پہ اتنا ہے غرور
اسلئے روتی ہے شبنم گل کو خنداں دیکھ کر

المدد اے لذتِ غم۔ المدد اے صبر و ضبط!
کانپ اٹھتا ہوں میں رنگِ شامِ ہجراں دیکھ کر

دل کی دنیا مختصر کس کس کو دے کوئی جگہ
تنگ ہوں میں اب ہجومِ شوق و ارماں دیکھ کر

کس کو آتا تھا اے مسلم! میری توبہ کا یقیں
اب تو کچھ مجھ کو بھی شک ہے ابرِ باراں دیکھ کر

کیشو سوت

کرشنا جی کیشو واسطے نام - تخلص کیشو سوت - وطن اصلی کوکن لیکن تعلیم کے سلسلہ میں ان کے جدامجد پونہ آئے اور وہیں بس گئے - رام گنیش گڈکری شاعری میں انھیں کو اپنا گرو مانتے تھے مرہٹی شاعری میں انہوں نے ایک نئے دور کا آغاز کیا - انگریزی شاعری کے اصولوں کو مرہٹی زبان میں انہیں نے پہلے پہل رائج کیا - ان کے کلام میں بلند پردازی اور سوز و گداز ہوتا ہے. زبان بھی کسیقدر مشکل لکھتے تھے - مادر وطن کے متعلق مرہٹی میں انہیں نے سب سے پہلے اشعار کہے - اور یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری تمام و کمال نیچرل ہے - گڈکری کی طرح یہ بھی کم عمری ہی میں انتقال کر گئے. تمام زندگی تنگدستی اور مصیبت میں گذاری جیتے جی ان کے علم و کمال کی کوئی وقعت نہیں کی گئی لیکن مرنے کے بعد جو عروج ان کے کلام کو حاصل ہوا غالباً بہت کم شاعروں کو میسر آتا ہے. ان کے ذخیرۂ شاعری میں تقریباً ۱۵۰ Sonnets (قطعات) ہیں -

ذیل میں ان کی جو نظم درج کی جاتی ہے اس میں اگرچہ کوئی خاص بات نہیں ہے تاہم سادہ بندش اور آسان و عام تشبیہات جو نیچرل شاعری کی جان ہیں خصوصیت سے قابل غور ہیں - یہ نظم شاعر کی تعریف میں ہے:-

ہم کیا ہیں؟

(کیشو سوت کی نظم کا لفظی ترجمہ)

ہم کیا ہیں؟ کیا بتائیں مخلوق خوب تر ہیں
ہم سب کے کھیلنے کو دنیا کے بحر و بر ہیں

جذبات شاعری سے ہم شعبدے دکھائیں
بے خوف جسطرف کو چاہیں قدم اٹھائیں
پست و بلند کے ہم اسرار جانتے ہیں
دولت کی سب نمائش بےکار جانتے ہیں
پانی بغیر اپنی ہم تشنگی بجھائیں
اور حسن کی کشش کا آنکھوں سے لطف اٹھائیں
گندم کو بھس بنائیں بھس کو بنائیں گندم
جادوگری سے اپنی ہوش و حواس ہوں گم
ناچیز شے کو کس نے جنس گراں بنایا
دوزخ نما جہاں کو جنت نشاں بنایا
اپنا ہر اک اشارہ کرتا ہے اک نگارش
بے چارہ مجرموں کی کرتے ہیں ہم سفارش
سن لو کہ ہیں غنیمت دنیا میں دم ہمارے
ہیں آسماں کی زینت جسطرح سے ستارے

"پن پرچھاؤ"

مرہٹی لٹریچر کا مایۂ ناز ڈرامہ مصنفہ رام گنیش گڈکری

(ترجمہ خباب اسلامی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

الیشور:۔ وسندرا! میری توقعات بیجا نہیں تھیں۔ واقعات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے ان امیدوں کو دل میں جگہ دی تھی۔ کچھ مجھ ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہر شخص امید کسی نہ کسی بھروسہ پر رکھتا ہے ہاں! نوعمری کے زمانہ کی آرزوئیں کسی قدر شوخ ہوتی ہیں جو زمانہ کی طوالت کے ساتھ پھیکی پڑتی جاتی ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی دن پوری ضرور ہوکر رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے دنیا بر امید قائم۔ اور اس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نظر فریب دنیا تارک الدنیا سنیاسیوں کا مسکن ہوتی۔ یا اس میں انسانوں کے بجائے حیوان بستے میں نے جو کچھ کہا یہ ایک عام اصول ہے میرے حالات کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ میرے مناسب حال تو یہ مصرع ہے۔

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

سچ بھی یہی ہے کہ تمناؤں کو دل میں جگہ دیتے وقت ہم خدا کے نامعلوم بھیدوں کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہمیں ناکامی ہوتی ہے۔ خدا کی مرضی جب ہمارے ارادوں کے خلاف ہوتی ہے تو یا تو ہمارے عزائم ملیامیٹ ہوجاتے ہیں یا ان سے غلط نتائج نکلتے ہیں۔ بالکل اسی طرح گردش ایام نے میرے نوشتۂ تقدیر کو برعکس واقعات سے تبدیل کردیا ہے۔ اچھا وسندرا! اس ذکر کو جانے دو اس سے کچھ حاصل نہیں۔ میں نے ان معاملات پر اپنی مختصر سی زندگی میں اس قدر غور کیا ہے کہ اب میں ذرا سا ذکر بھی چھیڑتا ہوں تو وہ اس قدر پریشان کن ہوجاتا ہے کہ سننے والے اکتا جاتے ہیں جسطرح ایک دیوانہ کی

دیوانگی اس کی بدنصیبی کا ثبوت ہے - اسی طرح میری یہ آشفتہ بیانی میری سیہ بختی کی دلیل ہے میں نہیں چاہتا کہ ان باتوں کی تمہارے سامنے زیادہ تفصیل کروں -

وسندرا :- آہ الیشور! تمہاری باتوں سے میرا دل خون ہوا جاتا ہے دیکھو میں پھر کہتی ہوں - الیشور! ذرا خیال کرو - آخر ورنداون کا پیغام بھی تو میرے باپ نے نامنظور کیا؟ اس میں شک نہیں کہ انہیں اس کا رنج ہوا لیکن پھر انہوں نے دوسری جگہ شادی کر لی -

الیشور :- کیا؟ ورنداون نے شادی کی؟ اگر یہ سچ ہے - تو وہ حقیقت میں تمہارے لائق نہیں تھا - وسندرا! تمہارا یہی مطلب ہے نا؟ کہ ورنداون نے شادی کی اور اب وہ ایک کامیاب زندگی بسر کر رہا ہے؟ -

وسندرا :- مجھے کالندی (ورنداون کی بیوی) اور اس کے میکے کے حالات سے واقفیت نہیں ہے - ہاں ظاہری حالت نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے - حالانکہ ورنداون آرندھتی میں ایک زمانہ سے رہتا ہے اور "ان" سے (میرے شوہر سے) اس سے بہت دوستی بھی ہے اس کا لشکر "انہیں" کے زیرنگرانی ہے اس وقت آرندھتی کے سرداروں میں ورنداون ایک مشہور سردار ہے .... ہاں خوب یاد آیا! ان کا بچہ بھی ہمارے دینار کا ہم عمر ہے -

(دامینی کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں دامینی! ہمارا دینار اور کیتن (ورنداون کا لڑکا) ہم عمر نہ ہوں گے -

دامینی :- ہاں بائی جی! بالکل ملتے جلتے ہیں - اور دونوں ابھی ایکسال کے نہیں ہوئے

الیشور (دینار کو دیکھ کر) یہ تمہارا "ننھا" ہے؟ اس کا نام کیا دینار نہیں؟ ...... ہو بہو اپنی ماں کا نقشہ ہے حرکات و سکنات بھی ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں ...... دیکھو نا! نظر ملتے ہی ہنسنے لگتا ہے - بڑا شریر ہے - دینار! یہ کب کی دوستی ہے؟ — وسو! (وسندرا کا مخفف) اگر تمہارے باپ زندہ ہوتے تو تمہارے بچے کی صورت میں تمہارے ڈکپن کی تصویر بھی دیکھتے - تم دونوں میں کس درجہ

مشابہت ہے۔ تمہارے باپ کی یہ دلی آرزو تھی کہ تمہاری اولاد دیکھیں۔

وسندرا :۔ گذری ہوئی باتوں کا ذکر کیا؟ میرے باپ تو تمہیں بھی بہت مانتے تھے بچپن میں تمہیں نہایت شوق سے کھلاتے تھے۔

آج دینار کو دیکھ کر انہیں جتنی مسرت ہوتی اتنا ہی تمہاری حالت دیکھ کر ملال ہوتا۔

الیشور (خود بخود) آہ! اس بچہ کو دیکھکر میرے دماغ میں اتنے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ میں کھوجاتا ہوں۔ یقیناً اگر میں اسے گود میں لینے کی کوشش کروں گا تو وہ میرے ہاتھوں سے گرجائے گا ——— (وسندرا سے) وسندرا!

درنداون کے متعلق بس اتنا ہی کہہ کر چپ ہو رہیں ۔

وسندرا :۔ مجھے اتنا ہی کہنا تھا ۔ اچھا اب مستقبل کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

الیشور :۔ بہت موقع سے پوچھا! اسی سوال کے جواب سے تمہیں میری اس ملاقات کا مقصد معلوم ہوجائے گا۔ وسندرا! اس زندگی کی مسافت میں عالم کائنات کی رنگا رنگی نے مجھے کچھ عرصہ کے لئے محو تماشہ کرلیا تھا لیکن اب تو قدرت کی صناعیوں میں بھی اتنی قوت نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی متوجہ کرسکیں۔ پہاڑوں کی سربفلک چوٹیاں اب مجھے گھر کی چوکھٹ معلوم ہوتی ہیں۔ پرفضا چمنستان مجھے اب سنسان مقام دکھائی دیتے ہیں اور عالم تنہائی میں کسی کی دردبھری آواز مجھے ایک ہنگامہ سے بھی زیادہ ناگوار گذرتی ہے جس دل نے اپنی تمام آرزوؤں کو صرف ایک مقصد پر نچھاور کردیا ہو اس کے لئے اس مقصد کے انتظار کی مصیبتوں کا واحد علاج خانہ بدوشی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں یہاں آیا ہوں ۔

(باقی آئندہ)

سروشِ مستقبل

اے اسیرِ آرزو اے نامرادِ زندگی!
اب تجھے آتی نہیں بھولے سے یادِ زندگی

ایک دن وہ تھا کہ تو ناواقفِ افتاد تھا
تیرے دل کا گوشہ گوشہ اک سکون آباد تھا

تیرا دل جوشِ نشاط و عیش سے معمور تھا
آہ ان ایّام میں تو کسقدر مسرور تھا!

آج تو ہے اور آغوشِ مزارِ بےکسی
تیری تربت پر برستا ہے غبارِ بےکسی

ذرّہ ذرّہ تیرے مرقد کا بنا دلگیر ہے
اور تو ناکامِ وصلِ یار کی تصویر ہے

ہائے وہ تیری جوانی وہ ترا عہدِ شباب
آج تو ہے قبر کی آغوش میں مصروفِ خواب

وہ دوشیزہ جو نہ لیتی تھی کبھی تیری خبر
اور تو روتا تھا جس کی یاد میں شام و سحر

آج وہ ہے تیری فرقت میں پریشاں اور خوار
یاد تیری کر چکی ہے ان کو برباد و فگار

اب جفا اُس سے وہ اپنی خود پشیماں ہے بہت
تجھ سے ملنے کے لئے بیتاب و نالاں ہے بہت

عشق کے آثار اس پہ ہو چکے ہیں آشکار
اس کے اجزائے جوانی بن چکے ہیں سوگوار

اب وہ خود جوگن بنی پھرتی ہے تیرے سوگ میں
ہو گئی ہے مبتلا رنج و الم کے روگ میں

کاش تو اس وقت اس کا حسن حیراں دیکھتا
اس کی رگ رگ میں وفا کا جزوِ پنہاں دیکھتا

روح تیری ہجر میں اس کے تڑپتی ہے بہت
حسرتِ واماندہ گو اب تک مچلتی ہے بہت

لیکن اک دن آئیگا پھر عشقِ رفتہ جوش میں
اس کا حسنِ جانفزا ہوگا تری آغوش میں

وہ تری بربادیاں اور وہ تری واماندگی
آہ افسانہ ترا دنیا نہ بھولے گی کبھی!

واہ رے ہمت تری پی ہی لیا جامِ وفا
جان دیکر اس کی الفت میں کیا نامِ وفا

لے ترے مستقبلِ رنگیں کا نغمہ گا چکا!!
کون؟ میں آشفتۂ غم طالبؔ قدسی نوا

عرشِ نیرنگی جھلکتا ہے تری افتاد میں
پھر بہار آئے گی تیرے گلشنِ برباد میں

(مرزا عبدالمجید طالبؔ سیمابی جہلمی)

الشمس

"آفتاب کا تاریک مستقبل"

(از محمد صدیق مالیگانوی)

زمانۂ جدید کے علمائے فلکیات آئے دن جو انکشافات کرتے رہتے ہیں وہ اگر عوام کے لئے نہیں تو کم از کم علمی دنیا والوں کے لئے ہیجان کا باعث ضرور ہوتے ہیں۔ اجرام فلکی کے دور اوّلین کے حالات یعنی قصہ ہائے ماضی اب اسقدر عام ہو چکے ہیں کہ اگر کسی اسکول کے طالبعلم سے بھی دریافت کئے جائیں تو وہ فوراً جواب دیگا کہ "زمین پہلے اس حالت میں تھی۔ سورج ایسا تھا۔ چاند ویسا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ قصے ایک تعلیم یافتہ شخص کی نظر میں "پھیکی داستان" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لیکن اب انہیں گوش برآواز ہو جانا چاہئے کہ ماہرین فلکیات نے ان کی دلچسپی کے لئے اجرامِ فلکی کے قصہ ہائے ماضی کے کہنہ راگ کو ختم کر کے داستان مستقبل کا دلکش ترانہ چھیڑ دیا ہے۔ چنانچہ نیرنگ خیال لاہور میں "القمر" کے عنوان سے جو میرا مضمون شائع ہوا ہے اسے پڑھکر ارباب علم نے ماہتاب کے دور آخری کا کافی اندازہ کر لیا ہوگا۔ اس مضمون کو پڑھ کر جہاں دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کو صدمہ ہوا۔ وہاں ہمارے شعراء حضرات نے خوب بغلیں بجائیں اور زبان حال سے یہ کہا کہ "اچھا ہوا ہمارے خیالی معشوق کے دو منھ چڑھانے والوں (آفتاب و ماہتاب) میں سے ایک معدوم ہوا جاتا ہے" لیکن ان شعراء حضرات کے لئے مزید خوشخبری یہ ہے کہ ماہتاب کی طرح آفتاب کا بھی مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے ان کے لئے وہ ایک بہترین موقعہ ہوگا جبکہ سارا عالم تاریک ہو جائیگا۔ اور وہ دنیا کی ہر شئے کو شمعِ روئے یار کی روشنی میں دیکھیں گے۔

آفتاب کے متعلق علماء فلکیات نے جو پیشینگوئی کی ہے یقیناً وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ سطحی نظر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب ہی ایک ایسا آتشیں کرہ ہے جو جوّ سماء کے تمام اجرام سے بڑا ہے مگر حقیقت امر اس کے برعکس ہے۔ فضائے آسمانی میں ایسے ہزاروں ستارے ہیں جو آفتاب سے بزرگ و روشن ترین ہیں۔ لیکن وہ ہم سے اتنی دور واقع ہوئے ہیں کہ انسانی نظر کا تو کیا ذکر ہے علمائے ہیئت کی انتہا رس دور بینیں بھی ان کے مشاہدہ کے وقت اپنی ضعف بصارت کا اقرار کر لیتی ہیں۔ ان کی بزرگی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم ایک موٹر کار میں سوار ہو کر فی ساعت ۶۰ میل کی رفتار سے شبانہ روز سفر کرتے رہیں تو ۱۷ دن ۸ گھنٹے میں کرہ زمین کا چکر لگا سکتے ہیں اور اسی رفتار سے اگر ہم آفتاب کا ایک طواف کریں تو پورے پانچ سال صرف ہوں گے۔ لیکن انطارس نامی ستارہ کے گرد ایک چکر لگانا چاہیں تو مدت کا ہندسہ ۱۳۷۰ سال پر آکر ٹھہرتا ہے۔ اس ستارہ کا قطر ۲۷ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے یعنی یہ کرہ آفتاب سے ۳۰۰ گنا بڑا ہے۔ اس قسم کے بیانات پڑھ کر قارئین کرام یقیناً الجھن میں پڑ جائیں گے کہ آخر ستاروں کی بزرگی کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں؟

ایڈنگٹن نامی ایک ماہر فلکیات نے اس حقیقت کو دریافت کیا ہے کہ جو ستارہ جسامت میں آفتاب سے ۵۰ گنا بڑا ہے وہ بزرگی کی انتہائی حد کو پہنچا ہوا ہے۔ اور یہی وہ حد ہے جس سے متجاوز کوئی ستارہ ہو نہیں سکتا کیونکہ اگر ایسا ہوا تو وہ شق ہو جائیگا۔ اور اس کے ٹکڑے فضا میں منتشر ہو جائیں گے۔ کسی ستارہ کی جسامت کا دار و مدار اس کے اجزاء ترکیبی کے وزن پر ہوتا ہے۔ یہ جسامت، شکل سے مختلف ہوتی ہے۔ شکل خواہ کتنی ہی بزرگی کا اظہار کرے لیکن جسامت حد معینہ سے زائد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ شکل کے لحاظ سے اگرچہ انطارس آفتاب سے سینکڑوں گنا بڑا ہے تاہم اس کی جسامت آفتاب کے ۵۰ گنا سے زیادہ نہیں ہے۔

جسطرح ستاروں کی بزرگی محدود ہے اسیطرح ان کے چھوٹے ہونے کی بھی ایک حد معین ہے۔ جن ستاروں کی جسامت آفتاب کے ۱/۲ سے کم ہے وہ ہرگز روشن نہیں رہ سکتے۔

کیونکہ ان کی سطح پر ۵۰۰۰ فارن ہیٹ حرارت بہم نہیں پہنچ سکتی اور حرارت کی اتنی ہی مقدار کسی ستارہ کے روشن و مرئی ہونے کے لئے درکار ہے۔ چنانچہ فضا میں ایسے ہزاروں غیر روشن اجرام نظام شمسی کی جکڑ بندیوں سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہماری نظریں ان کو دیکھنے سے معذور ہیں۔

مذکورہ بالا اصولوں کو ذہن میں لاکر ہم آفتاب کے متعلق بھی کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کرسکتے ہیں۔ سطح آفتاب کی حرارت بیش از بیش ۱۶۲۰۰ فارن ہیٹ تھی۔ اب یہ حرارت ۱۰۸۰۰ فارن ہیٹ رہ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب کی حرارت روز بروز روبہ انحطاط ہے۔ اور ایک دن ایسا ضرور آنیوالا ہے جبکہ یہ حرارت روشنی کی مقدار معینہ سے گھٹ جائیگی۔ اور آفتاب محض ایک غیر روشن جرم ہوکر رہ جائیگا۔ تاہم اس حالت کو پہنچنے کے لئے ابھی لاکھوں برس کا عرصہ چاہئے۔ کیونکہ سطح آفتاب پر جو حرارت بہم پہنچتی رہتی ہے وہ کوئلہ کی حرارت کی طرح نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ آفتاب کے اندرونی اجزاء کے پھٹنے اور تغیر پانے سے پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے گھٹنے کی مقدار بہت ہی ہلکی رفتار میں ہے۔

الغرض آفتاب ابھی بہت دنوں تک افضائے عالم کو اپنے نورانی جلووں سے فیضیاب کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہماری سینکڑوں نسلیں ہماری ہی طرح اس نورانی خوانِ یغما سے حصہ لیں گی اور چلی جائیں گی ؎

نہیں معلوم دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے مجلس کی

(اقتباس)

تعارف

اسلام اینڈ دی ڈیوائن یونیٹی - اس کتاب میں مولانا خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے توحید کے متعلق اسلام کے صحیح عقائد کا ذکر نہایت عام فہم اور سلیس انگریزی میں کیا ہے۔ یہ کتاب خواجہ صاحب کی کم و بیش ربع صدی تک تبلیغی میدان میں علمی جد و جہد و تجربات کے بعد قابل ستائش کاوشوں کا علمی نتیجہ ہے۔ اسقدر اختصار کے ساتھ ایسی سلیس زبان میں اس مسئلہ پر کوئی مستند کتاب اردو اور انگریزی میں موجود نہیں۔ فاضل مصنف نے یہ کتاب دراصل یورپ میں تبلیغی مصرف کے لئے لکھی ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر دنیا کے تمام قابل ذکر مذاہب اور جماعتوں کے خیال اور ان کی غلطیوں کا ازالہ مدلل و احسن پیرایہ میں کیا ہے۔

حصہ، باب، فصل اور فقرہ کی تقسیم نیز حواشی میں ذیلی عنوان وغیرہ کے خاص اہتمام کے ساتھ طباعت و کاغذ بھی دیدہ زیب ہیں۔

تعلیقات زیریں کی بجائے کتاب کے آخری حصہ میں حوالہ جات کی فہرست کا اضافہ موزوں اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ایک نمایاں کمی کتاب میں رہ جاتی ہے جس کی طرف آئندہ اشاعت میں توجہ ضروری ہے، جس باب میں جناب مصنف نے حضرت علیؓ و امام جعفرؒ وغیرہما کے اقوال پیش کرکے یہ بتلایا ہے کہ جناب نبوی کی تعلیم توحید سے ان کے متبعین نے کیا مطلب سمجھا، اسی ضمن میں اکابرین صحابہؓ کم از کم باقی تین اصحابؓ کے آراء و افکار کا اظہار ضروری تھا۔ جمہور اسلام کے نزدیک ان میں سے ہر ایک رموز شناس شریعت ہے۔ بہرحال کتاب باقی تمام حیثیتوں سے اس قابل ہے کہ اسلامی و غیر اسلامی انگریزی داں طبقہ اس سے کافی استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کو اس بیش بہا تصنیف سے محروم نہ رہنا چاہئے۔

تختی متوسط۔ حجم ۱۱۶ صفحہ مجلد، متن سیاہ حواشی و جدولیں سرخ۔ قیمت عہ۔ پتہ:۔

خواجہ غلام الحسنین۔ لیڈیز ٹریننگ کلاس کھانڈیا اسٹریٹ بمبئی سے طلب کیجئے۔

خدا کی ہستی:۔ یہ بھی جناب خواجہ صاحب کی اردو تصنیف ہے۔ اس کتاب میں خدا کی ہستی کے متعلق عقلی و نقلی دلائل ایسے بہتر طریقے سے جمع کر دئے گئے ہیں کہ بظاہر قصوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل ہر قصہ کے افتتاح پر خدا کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ تمام براہین بدیہات سے دی گئی ہیں یا نقلیات سے۔ لیکن اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ کوئی غیر واقعی چیز بیان نہو اس حیثیت سے اگرچہ کتاب مختصر ہے مگر علمی معیار و تحقیق سے گرنے نہیں پائی۔ زبان کی انتہائی سہولیت اور اسلوب بیان کی پاکیزگی کی بناء پر اس کتاب سے ہر شخص کچھ نہ کچھ طمانیت حاصل کرسکتا ہے۔ بالخصوص بچوں کے لئے بہت دلچسپ' سہل الفہم اور مفید ہے۔ لکھائی چھپائی جلی اور اچھی ہے۔ کاغذ عمدہ' پاکٹ ایڈیشن۔ قیمت ۲ر ۔ مذکورہ بالا پتہ کافی ہے۔

مثنوی اسرار ہستی:۔ جناب گویا جہاں آبادی نے اردو میں بالکل جدید رنگ میں یہ مثنوی لکھی ہے۔ نہایت مشکل چیزوں کو آسان اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ باوجود اصطلاحات علمیہ وغیرہ کے استعمال کے زبان کی ندرت و صفائی بہت خوبی کے ساتھ قائم رکھی ہے۔

اسرار ہستی میں مادیت و تصوریت وغیرہ وغیرہ کے خاص مسلک سمجھنے کے لئے تو البتہ کسی قدر منطق و فلسفہ سے مس کی ضرورت ہے۔ لیکن ان دو چار صفحوں کو چھوڑ کر ساری کتاب سے معمولی استعداد کا ہر شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ہر مسلک کو بلا کسی اختلاط کے بیان کرنے کے بعد مصنف کا اپنی طرف سے استفہامیہ انداز میں ثبوت خاص چیز ہے۔

شاعر نے کتاب کی ابتدا میں بصائر اور آخر میں تبسم پر اپنے خاص رنگ میں گہر افشانی کی ہے۔ تبسم پر پہلا شعر یہ ہے:۔ زبان تبسم سمجھ میں نہ آتی
ادائیں ہوئیں ترجمان تبسم

پوری نظم اسی طرز میں ہے۔

ہم ادبستان کے معاونین سے اس کے پڑھنے کی خصوصیت کے ساتھ سفارش کرتے ہیں۔ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت ۸/ ملنے کا پتہ :- سید ضامن حسین گویاؔ
محلہ احمد زئی پیلی بھیت۔

تازہ بتازہ نو بنو

اس عنوان کے ماتحت ہم ان مقامی اہل قلم اور اہل ذوق حضرات کی نگارشیں پیش کریں گے جو "ادبستان" کی تحریک کے سلسلہ میں میدان میں آئیں گے۔ تاکہ ناظرین کرام "مقامی دلچسپیوں" سے بھی لطف اندوز ہوسکیں اور یہاں کے روز افزوں مذاق کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

خلدآباد میں چند گھنٹے

(جناب منشی شیخ احمد عثمان صاحب

کائنات کا ہر ذرہ اثرات سے لبریز ہے۔ لیکن میں تو ایک ایسا دل چاہتا ہوں جو اس ذکر سے بے تاب ہو جائے۔ اس تصور سے دھڑکنے لگے۔ مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی۔ مجھے صحرا میں ایک جھونپڑا دیدو کہ صبح و شام گاؤں کی طرف مویشیوں کی آمد و رفت دیکھا کروں۔ اور چرواہے کی بانسری کی آواز سن کر مست ہو جایا کروں۔ مجھے ان محلات میں نہ لے جاؤ جہاں کے دولت مند مکیں زندہ ہیں۔ جہاں عیش و عشرت کی مجلسیں گرم ہیں۔ بلکہ مجھے موقع دو کہ میں ایک شکستہ و غیر آباد ایوان کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں ایک گھنٹہ فرش خاک پر بیٹھ جاؤں۔ اور یہی وہ مذاق طبیعت تھا جو مجھکو کشاں کشاں خلدآباد لے گیا۔ جسکو برہان الدین اولیا کی آرامگاہ اور عالمگیر کی خوابگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

بندگی آداب عرض کورنش مجرا حضور
آرزو آنے کی یاں مدت سے دامنگیر تھی

آہ نہ پوچھئے شکستہ عمارات کا ایک سلسلہ دیکھکر دل پر کیا اثر ہوا۔ حیرت ہوتی ہے کہ روز لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور پھر بھی زندہ ہیں۔ ایک ایک اینٹ بجائے خود ایک مفصل تاریخ اور داستان ہے۔ لیکن اب نہ اس تاریخ کے دیکھنے والے ہیں اور نہ اس داستان کے سننے والے ہیں۔

اے آسودگانِ خاک! ہمیں نہیں معلوم تم کس عالم میں ہو۔ اور تمہاری زندگی جسے اب صرف ایک طویل اور خاموش رات کہنا چاہئے کسطرح گذرتی ہے۔ لیکن ہاں اسقدر ضرور جانتے ہیں کہ تم جس حالت میں بھی ہو بہتر ہو۔ اور ہماری زندگی مہمل اور بے معنی ہے۔ اور تمہاری موت ہمارے لئے سامانِ فکر و عبرت ہے۔ ہم جینے پر مرتے ہیں اور تم مرنے کے بعد بھی جیتے ہو۔ لوگ تم سے شکایت کرتے ہیں کہ تم بولتے نہیں۔ خدا جانے ہماری سنتے ہو یا نہیں۔ لیکن میں یہ شکوہ تم سے نہیں کرتا کیونکہ حقیقتاً میرے لئے اگر تم میں کوئی شے قابل قدر ہے تو وہ تمہاری خاموشی ہے۔ لاکھ کوئی چیخے روئے سر دھنے مگر تم اس سے متاثر ہوتے نظر نہیں آتے۔ آہ! معلوم ہوتا ہے کہ تم میں ملکوتی استغنا ہے اور تمہیں کسی کی پروا نہیں۔

یہ خیالات لئے ہوئے میں مقابر و مزارات سے گذرا اور اس مقام پر پہنچا جہاں جاتے ہوئے حقیقتاً میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک مقدس ہستی کے حضور میں ایک بدترین وجود کا نیاز۔ نور کے سامنے ظلمت کی جسارت۔ کیسا حیرت ناک منظر تھا۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح ڈرتے ڈرتے گیا اور پائیں مزار کھڑا ہوگیا۔

میں نہ صاحب مراقبہ ہوں اور نہ مجھ میں حس باطن کہ وہاں کا عالم سمجھ سکتا۔ لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ایک غیر معلوم کیفیت تھی ایک مجہول حال تھا جس سے میں متاثر ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ جہاں ایسا برگزیدہ وجود آرام کر رہا ہو۔ اور جہاں خدا معلوم اور کتنی مقدس و محترم روحوں کا نشیمن ہے۔ میں کیونکر آنے پایا۔ بے اختیار وہاں سے دبے پاؤں چلے آنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور چلا۔ لیکن چند قدم چلا ہوں گا کہ کسی نے کہا کہ یہی شہنشاہ عالمگیر کا مزار ہے

میں دفعتہً چونک پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مرحوم کے مزار پر حسرت ٹپک رہی ہے۔ اور اس غضب کی سادگی تھی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوا کہ مرحوم کی وصیت تھی کہ میری قبر آراستہ نہ کی جائے۔ پاؤں پھیلا کر تو داتا خاک پر سوتا ہے کیوں ؛ ہند سے لے تا دکن چلتی تری شمشیر تھی۔

ہائے افسوس ! مسلمان : زندہ درگور مسلمان۔ مجھے سخت افسوس ہوا کہ ایسے جلیل القدر اور شریعت پناہ بادشاہ پر مورخین کیوں الزام لگا رہے ہیں۔ کیا انہیں حشر میں خدا کو منہ نہیں دکھلانا ہے۔ ان کا حال برا ہو گا۔

ابھی میری ناقص زبان سے یہ چند فقرے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ جسم لرزنے لگا ایک رعب چھا گیا اور ایک ناقابل بیان کیفیت طاری ہو گئی۔ ہر قدم پر دل دھڑکتا تھا۔ ہیبت شاہی کی ابتک اسقدر تاثیر تھی کہ فاتحہ پڑھا گستاخی اور بے ادبی کی معافی چاہی اور مکان پر واپس آیا۔ مگر ابتک وہ سماں میری نظروں کے سامنے ہے۔

ہندوستان میں کوکین کسطرح آئی — اخبار علمیہ

۱۸۷۰ء میں مقام کیو سے کوکین کے پودے سیلون میں لائے گئے۔ ۱۸۷۶ء میں مدراس کی ایک زراعتی کمیٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ کوکا کی کاشت ہندوستان میں اچھے پیمانہ پر شروع کر دینی چاہئے کیونکہ اس چیز کی تجارت میں روزافزوں ترقی ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کی ضرورت ابھی اور بڑھے لیکن ۱۸۸۵ء تک اس تجویز پر کوئی عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ میں دوا کے لئے مفید ہونے کی وجہ سے کوکین کی پتیوں کی مانگ یورپ میں بڑھی۔ اور اس وقت اس زراعتی کمیٹی نے کلکتہ کے باغیچہ سے اس کے متعدد پودے لیکر ہندوستان کے مختلف حصوں میں کاشت کے لئے تقسیم کر دئے۔ اب گورنمنٹ نے بھی اس طرف توجہ کی اور اسے کارآمد بنانے کے متعلق امریکہ سے تمام معلومات بہم پہونچائیں۔

کوکین اگرچہ ہندوستان میں صرف اس غرض سے لائی گئی تھی کہ نہایت احتیاط سے ایک محدود دائرہ میں اس کی کاشت کی جائیگی اور اس کی تجارت پر حکومت کی سخت نگرانی رہیگی۔ لیکن چونکہ اس کے پودے ہندوستان کے مختلف حصوں میں شروع شروع میں تقسیم کر دئے گئے تھے تاکہ تجربہ کیا جائے کہ کس مقام کی آب وہوا اس پودے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے اس کی کاشت اور تجارت پر پورا قبضہ نہ رہ سکا۔ اور اس کا استعمال عام ہو گیا چنانچہ آئے دن اس قسم کی گرفتاریاں اور مقدمات ہوتے رہتے ہیں جو صرف کوکین کی ناجائز تجارت سے پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا کے قدیم ترین باشندے — اخبار علمیہ

آسٹریلیا کے اصلی باشندے دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں۔ خصوصاً بالکل شمالی حصہ جسے جزیرہ نمائے کیپ یارک کہتے ہیں ان لوگوں سے آباد ہے جو یہاں کے تمام باشندوں سے قدیم ہیں۔ وہ دنیا کی قدیم ترین قوم کے افراد ہیں جن کے وجود کا پتہ گذشتہ دس ہزار سالوں تک چلتا ہے۔

آسٹریلیا کے اس حصہ میں اب تک بہت کم لوگ پہونچ سکے ہیں اور اس لئے وہاں کے باشندوں کے

حالات بخوبی نہیں معلوم ہو سکے۔ حال ہی میں مسٹر میکلارن نے اس خطۂ زمین کی سیاحت کے حالات ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں۔ یہ پہلے انگریز ہیں جنہیں اس ملک اور اس قوم میں کچھ عرصہ زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے باشندے اس درجہ وحشی ہیں کہ شروع شروع میں کچھ عرصہ تک تو مجھے ہر وقت مسلح رہنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ رات کے وقت بھی میں اپنا ریوالور ساتھ رکھ کر سوتا تھا۔

آگے چلکر وہ لکھتے ہیں کہ جنگل کی جڑی بوٹیوں کی مخفی قوتوں کی عظیم الشان اور بیشمار معلومات جو اس قوم کو ہے غالباً دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں ہے۔ معمولی مرض بخار سے لیکر مشکل سے مشکل مرض کا علاج یہ لوگ محض خس و خاشاک سے نہایت حیرتناک کامیابی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت بیحد تربیت پذیر ہے۔ کوئی بات جو ایک دفعہ دکھا یا بتا دی جائے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کی ایک خاص زبان ہے جسمیں وہ بلا تکلف ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر لیتے ہیں تاہم پیغام رسانی کے عجیب و غریب طریقے انہیں معلوم ہیں۔ چنانچہ دھوئیں کے ذریعہ خبر پہونچانا جو آجکل جنگی دنیا میں ایک معمولی بات ہے پہلے پہل یہیں دیکھا گیا۔ وہ خشک لکڑیاں جمع کر کے دھواں پیدا کرتے ہیں اور اسے مختلف طریقوں پر بلند کر کے دور و دراز کے مقامات پر خبریں پہونچا دیتے ہیں۔

مسٹر میکلارن لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے گورنمنٹ ریزیڈنٹ سے سفارش کر کے ان لوگوں کے لئے کچھ کمبل منگائے۔ اور سبھوں کو جمع کر کے ایک مختصر سی تقریر کی جسمیں انہیں بتایا کہ تمہیں اس گورنمنٹ کا بہت مشکور ہونا چاہئے جس نے تمہیں کمبل جیسی کارآمد اور آرام دہ شے عنایت فرمائی ہے پھر ایک ایک تقسیم کر دیا۔ اس روز تو سب کمبل لیکر چلے گئے لیکن دوسرے ہی روز آکر شکایت کی کہ وہ بدن میں چبھتا ہے اور بالکل ناقابل استعمال ہے۔ چنانچہ پھر اس روز سے کسی نے اس کمبل کو نہ بچھایا۔ بلکہ جھونپڑوں کی چھتوں پر بجائے کھپریل کے چھا دیا۔

معلومات

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دنیا میں ہر سال چار کروڑ سے زائد پیدائشیں ہوتی ہیں ۔

ایک نئے قسم کے ریشمی موزے اس ترکیب سے بنائے گئے ہیں کہ ان پر پانی یا کیچڑ کا اثر نہیں ہوتا

لندن میں ایک اتنی بڑی گھڑی بنائی جارہی ہے کہ صرف اس کی سوئیوں کا وزن نصف ٹن ہے ۔ اور منٹ کی سوئی کا طول پندرہ فٹ ہے ۔

گھوڑے کی بہ نسبت ایک آدمی میں ۱/۱۰ یا ۱/۵ قوت ہوتی ہے ۔ بیل میں ۲/۳ اور ۱/۲ خچر میں ۔

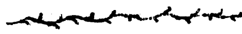
دنیا میں تقریباً ایک ہزار سے زیادہ مختلف اقسام کے سیب پیدا ہوتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک سو قسم کے تجارت کے کام آتے ہیں ۔

آسٹریلیا میں جتنا ٹکس ادا کیا جاتا ہے اس کا اوسط ۱۳ پونڈ ۸ شلنگ ۸ پنس فی کس پڑتا ہے ۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۳ پونڈ ۹ شلنگ ۶ پنس کناڈا میں ۱۳ پونڈ ۴ شلنگ ۸ پنس اور انگلستان میں ۱۹ پونڈ ۸ شلنگ ۲ پنس ۔

دیوار پر کاغذ لگانے کا دستور پہلے پہل چین سے شروع ہوا ۔ جسے ۲ ہزار برس گذر چکے ۔

تپ دق کے مریضوں کے لئے ڈاکٹر رچرڈ نامی سائنس داں نے ایک خاص قسم کے گراموفون رکارڈ

ایجاد کئے ہیں جو مریض کے دل کی ہر حرکت کو جذب کر لیتا ہے اور استعمال کے وقت تمام کیفیت جوں کی توں سنا دیتا ہے۔ اس ایجاد سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک ملک کے مریض کے صحیح حالات دوسرے ملک کے حاذق طبیبوں اور ماہر ڈاکٹروں تک بغرض معالجہ بھیجے جاسکیں گے۔



انگلستان کے ایک باشندے کا کبوتر فرانس میں گم ہوگیا۔ اور تین سال ۹ مہینے غائب رہنے کے بعد وہ پھر انگلستان پہونچ گیا ہے۔



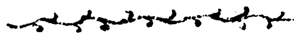
دودھ کشادہ برتن کی بہ نسبت تنگ برتن میں جلد خراب ہو جاتا ہے۔



انگلستان میں سب سے اونچا پانی کا ٹینک (تالاب) بنایا جا رہا ہے جس کی اونچائی ۱۵۵ فٹ ہوگی اس میں ۵۰۰۰۰ گیلن پانی آئیگا اور اس کا وزن ۸۰۰ ٹن ہوگا۔



انڈا اوبلنے کے بعد اگر پانی میں ڈال کر کسی ٹھنڈی جگہ رکھا جائے تو ایک روز تک خراب نہ ہوگا۔



تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اگر لندن کا تمام کوڑا سائنس کے اصولوں پر جلایا جائے تو اس سے ہر سال ۲۰۰۰۰۰ پونڈ برقی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔



بچپن کی شادی

ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ ایسی خرابیاں ضرور ہوتی ہیں جو اس کے لئے باعث ننگ خیال کی جاتی ہیں ۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی چند ایسے بُرے رسوم و رواج ہیں جنہیں اہل ہند اپنے لئے باعث ننگ تصور کرتے ہیں ۔ منجملہ ان کے بچپن کی شادی بھی ہے ۔ اگرچہ اس خرابی کا رواج عموماً ہندوؤں میں ہے لیکن جو چیز ملک کے لئے ننگ ہے وہ ہر قوم کے لئے اور ہر شخص کے لئے ننگ ہے ۔ حال ہی میں اس خرابی کے انسداد کے متعلق مہاتما گاندھی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے ۔ جس میں انہوں نے بچپن کی شادی کے نقصانات بتلاتے ہوئے اس قانون کا ذکر کیا ہے جو شادی کی عمر کے متعلق بننے والا ہے ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ میں ان معاملات میں قانونی بندشوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ اس رسم کا تعلق ہر شخص سے ہے اور جبتک کہ ملک کے ہر شخص کے خیالات اس رسم کے متعلق درست نہ ہوجائیں گے قانونی بندش بیکار رہے ۔ ضرورت ہے کہ اہل ملک ان باتوں کو سمجھنے اور غور کرنے کی کوشش کریں اور وہ تمام رسوم ترک کردیں جو قوم و ملک کے لئے باعث ننگ ہے ۔

عقد بیوگان

بچپن کی شادی کی طرح یہ مسئلہ بھی ہندوستان کے لئے باعث شرم ہے ۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی بیوہ عورتوں بلکہ لڑکیوں کو گھروں میں بٹھا رکھنا شروع کیا ۔ اگرچہ اس کے انسداد کے لئے کافی جد و جہد کی جا چکی ہے لیکن نتیجہ اس وقت تک خاطرخواہ نہیں نکلا ہے ۔ گھر اور گھرانوں کا ذکر چھوڑ دیجئے مسلمانوں میں بہت سے فرقے ایسے موجود ہیں جنہیں آج بھی یہ رسم اسی طرح جاری ہے حالانکہ ہندوؤں نے اس بات میں کامیابی حاصل کرلی ہے ۔ چنانچہ ذیل کے اعداد و شمار جو "ودھوا ویواہ" کے سکریٹری کی رپورٹ سے لئے گئے ہیں بتلاتے ہیں کہ ان کی کوششیں ناکام نہیں رہیں ۔ یہ ان بیوگان کی صوبہ وار تعداد ہے جن کی دوسری شادیاں کی گئیں ۔ پنجاب ۱۱۲۲ ۔ سندھ ۴۰ ۔ دہلی ۵۱ ۔ یوپی ۲۵۰ ۔ بنگال ۶۴ ۔ مدراس ۷ ۔ بمبئی ۵ ۔ ممالک متوسط ۸ ۔ آسام ۵ ۔ بہار و اڑیسہ ۱۲ ۔ جملہ ۱۶۰۹ ۔



بظل حمایت
انجمن معین الادب

اردو علم و ادب کا ماہوار مجموعہ
بمبئی

مقام اشاعت
عروس البلاد بمبئی

بنام جہان دار جان آفرین
حکیم سخن در زبان آفرین

نمبر ۲۱۵



جلد ا ...... نمبر ۵

معاون
منیر الہ آبادی

مرتب
رشید صدیقی

معاون
خلیل احمد سیکروی

ج ۱ — ۵

فہرست مضامین

ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

بزمِ ادب

گذشتہ ہفتہ مسٹر فاضل ابراہیم رحمۃ اللہ چیرمین مجلس تعلیمات بمبئی و ممبر اسمبلی نے دوران ملاقات مین اردو کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ بمبئی اور گرد و نواح کے مقامات مین تو بفضلہ اردو مستعمل ہے لیکن سنٹرل ڈویژن مین شولاپور وغیرہ کچھ ایسے مقامات ہین جہان بمشکل اُردو بولنے اور سمجھنے والے ملسکتے ہین اسکی وجہ صرف ایک ہے یعنی ان مقامات مین افراد سے لیکر انواع تک مرہٹی ہی ایک زبان ہے جو عام ہے پھر اردو کے لیئے وہان گنجایش کیونکر نکل سکتی ہے۔ توجہ اس لیئے نہین کی جاتی کہ اردو عدالت کی زبان ہی نہین کہ لوگ خواہ مخواہ اسے حاصل کرنے کے لیئے مجبور ہون۔

ہم اس امر کی کوشش مین شریک ہونے کے لیئے ہر وقت طیار ہین کہ ان اضلاع مین اردو کا پروپگنڈا کیا جائے۔ اور اگر ممکن ہو تو اردو کو نصاب تعلیم مین بھی داخل کرنے کی سعی کیجائے۔ کیا کوئی صاحب ذوق فرد یا جماعت اس باب مین کچھ کرنے کے لیئے تیار ہین۔؟

اندنون تصنع اور تقلید کچھ ایسی عام ہو رہی ہے کہ گویا ملک کا خمیر یہی ہے۔ صبح سے شام تک کی چھوٹی چھوٹی معمولی حرکات سے لیکر بڑے سے بڑے حادثات زندگی تک مین تصنع کا دخل ہے۔ رفتہ رفتہ ہم ان باتون کے کچھ ایسے عادی ہی ہو گئے ہین کہ یا تو اب ان کی تمیز کا احساس ہی کھو بیٹھے ہین یا اس جانب توجہ نہین کرتے۔ لیکن بعض حالتون مین یہ امور زیادہ خطرناک ہوتے جا رہے ہین جن کی جانب توجہ کرنی ضروری ہے۔ گذشتہ چند سالون سے مسلمان خواتین مین طوفانی سمندر کی جنون انگیز موج کی طرح آزادی نسوان کی جو تحریک اُٹھی ہے اس کی برکات کم و بیش ہمارے سامنے ہین عام طور پر لڑکیون مین تقلید مغرب کا جو شوق پیدا ہو گیا ہے اور دن بدن ترقی پذیر ہے، وہ کم مہلک نہین ممکن ہے کہ ان محفوظ مقامات مین اس مہلک شوق کے اثرات نہون یا بالکل کم ہون جہان مغربی طرز کی آزاد

سوسائٹیان نایاب ہین لیکن بڑے شہرون اور خصوصاً بمبئی مین اس تحریک کا جو عالم ہے اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے۔ اس مسئلہ پر اس سے زیادہ کچھ لکھنے سے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ علیا بیگم صاحبہ بھوپال کی اس تقریر کا خلاصہ پیش کر دیا جائے جو انہون نے علی گڈھ کی مسلم خواتین کے ایڈریس کے جواب مین فرمائی تھی۔ اس تقریر مین علیا بیگم صاحبہ نے نہایت شاندار طریقہ پر خواتین کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کرائی ہے۔ اور اپنی تقریر کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ایک خاص طرز بیان اختیار کیا ہے۔ فرماتی ہین:-

"میری عمر ستر سال سے زیادہ ہے۔ ممکن ہے میری لیاقت محدود ہو لیکن میرے تجربات وسیع ہین۔ مین نے اسلامی اور مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی ہے۔ اور ہمیشہ عورتون کے عروج و زوال پر غور کرتی رہی ہون۔ مین نے بچپن ہی مین مذہبی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اس لئے مجھے حق ہے کہ مین اپنی ہم جنسون اور خصوصاً مسلمان خواتین کے متعلق کچھ کہون۔

اے مسلم خواتین! ہر وہ عورت جو اپنے کو مسلم کہتی ہے احکام اسلام کے ماننے اور قرآن پاک کے قوانین کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ انسان بیشک آزاد ہے لیکن وہ حکومت یا مذہب کے قوانین سے قطعاً لاپرواہ نہین ہو سکتا۔ اسے ان مین سے ایک کی تعمیل کرنی ضروری ہے۔ ہم مسلمانون کو مذہب سے ہرگز ہرگز بغاوت نہ کرنی چاہئے۔"

"جو شخص کسی قوم سے مشابہ ہے وہ اسی کا ایک فرد ہے" اس لئے مین جو کچھ کہنا چاہتی ہون وہ قوانین اسلام کے عین مطابق ہوگا۔ ہماری تعلیم یافتہ لڑکیون مین دوسری اقوام کی مجلسی زندگی کے طور طریقے اور فیشن کی تقلید کا جو جذبہ روز بروز ترقی پذیر ہے اور جسے دوسرے الفاظ مین ترقی کہا جاتا ہے۔ یقیناً خطرناک ہے اور ایک تاریک مستقبل کی علامت ہے۔ یہ جذبہ تصنع و تقلید مردون و عورتون کے سوشل تعلقات اور اس سے بڑھ کر ان کی مذہبی لاعلمی کی بنا پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مین تصنع اور نمائش دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے ممالک کی عورتون کی بے ہنگام آزادی ایسے اصولون اور مقاصد کی بنا پر نہین ہے کہ ہم انکی نقل اتارنے کی کوشش کرین یہ ایک بالکل غلط خیال ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے ہر رسم و رواج کی تقلید تہذیب مین داخل ہے یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے اور مضحکہ خیز باتین کسی قوم کو مہذب نہین بنا سکتین۔"

ہمین افسوس ہے کہ جناب اسلامی کی علالت کی وجہ سے اس دفعہ مرہٹی کے ڈرامہ "پن پہا" کا ترجمہ شریک اشاعت نہین کیا جا سکا۔ اُمید ہے کہ آیندہ اشاعت مین اس کمی کی تلافی کردی جائیگی

جناب مرتب کی غیر متوقع علالت کی وجہ سے اس اہم ذمہ داری کا بوجھ مجھ ناچیز کے سر آگیا ہے۔ اور مین نے حتی الوسع اسکی انجام دہی کی کوشش کی ہے۔ ایسی حالت مین اہل نظر حضرات مجھے معذور سمجھین اور میری خامیون کو نظر انداز فرمائین۔

منیر آلہ آبادی

حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

(دلی کی بولی لکھنؤ میں)

(از مولوی عبد السلام ندوی)

دنیا مین مال و دولت، جاہ و ثروت، اور سلطنت و حکومت نے اگرچہ ہزارون احسانات کئے ہین۔ لیکن ان کے احسانات کی فہرست جس قدر روشن ہے۔ اسی قدر اُن کے مظالم کا نامۂ اعمال سیاہ بھی ہے۔ اور اس مین قساوت و سنگدلی کے صرف وہی واقعات مندرج نہین ہین جو مادیات سے تعلق رکھتے ہین۔ بلکہ غریب روحانیت بھی ان کی تیغ ستم سے مجروح نظر آتی ہے۔

علمی دنیا مین سینکڑون آدمی فطرت کی عطا کردہ قوتون سے مسلح ہو کر آئے۔ اور تنازع للبقا کی دائمی کشمکش مین ان روحانی ہتھیارون سے کام لیکر اپنے حریفون کو پیچھے ہٹانا چاہا۔ لیکن چونکہ مادی قوت نے اعانت نہین کی۔ اس لئے خود پیچھے ہٹ آئے۔ اور اگر ان فواء فطریہ کی غیر معمولی روحانی قوت نے انکو زندہ نہ رکھا ہوتا۔ تو آج میدان شہرت تو الگ وہ اپنے گوشۂ گمنامی مین بھی ڈھونڈنے سے نہین ملتے۔

علوم و فنون کی ہر شاخ اس قسم کی دردناک مثالین پیش کر سکتی، لیکن اسوقت صرف شاعری سے بحث ہے۔ اور ہمکو اس سلسلہ کی ایک نہایت قریب ترین مثال پیش کر کے سلطنت اور حکومت کے اس جبارانہ اقتدار کے مظالم کی پردہ دری کرنی ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ مین مصحفی اور انشاء کو اس درد انگیز مثال کے لئے عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مصحفی نے اردو زبان اور اردو شاعری کو جس سنجیدگی و متانت کے ساتھ ترقی دی۔ اور اس خاندان کا جو سلسلہ آج تک اس ادبی خدمت مین مصروف ہے۔ اس کے لحاظ سے اُن کے سامنے انشاء کی حقیقت ایک بھانڈ سے زیادہ نہین ہے۔ لیکن اُس زمانہ مین حکومت کی امداد و اعانت سے انشاء

ہی کا بول بالا ہوا۔ اور آج بھی اس ظلم کا اسقدر اثر قایم ہے کہ وہ مصحفی کے حریف خیال کیئے جاتے ہین اور اُن کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمکو بہت زیادہ دور جانے کی ضرورت نہین خود ہمارے زمانہ مین داغ امیر اور جلال کی شخصیتون کو اس کی بہترین مثال مین پیش کیا جاسکتا ہے جن مین داغ و امیر صرف اس لیئے زیادہ نمایان طور پر نظر آتے ہین کہ ایک حضور نظام میر محبوب علی خان بہادر والی حیدرآباد کا اور دوسرا نواب کلب علی خان بہادر والی ریاست رامپور کا اُستاد تھا لیکن ان دونون کے مقابل مین غریب جلال کے سر پر کوئی دنیاوی اقتدار سایہ فگن نہ تھا۔ بلکہ اس نے میر و مصحفی کی طرح گوشہ نشینی اختیار کر کے اپنی غربت و مسکینیت سے عاشقانہ شاعری کے قالب بیجان مین درد و غم۔ سوز و گداز، اور رقت و لطافت کی سیال روح پھونکی۔ اور ناسخ و تلامذہ ناسخ نے لکھنؤ مین شاعری کے چشمہ کو جس قدر کثیف اور گدلا کر دیا تھا جلال نے اس مین روانی اور لطافت پیدا کر کے مادی اور روحانی دونون حیثیتون سے میر و مصحفی کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی تھی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ تناسخ کے اصول کے مطابق اس اخیر دور مین میر و مصحفی دونون نے گوشہ نشین جلال ہی کے قالب مین نیا جنم لیا تھا۔

اردو شاعری کی تاریخ مین یہ واقعہ نہایت افسوسناک خیال کیا جاتا ہے کہ مصحفی کی شاعری کے زمانۂ عروج مین لکھنؤ نے ان کی کافی قدر دانی نہین کی بلکہ انشا کے مقابل مین انکو سخت ذلت و توہین برداشت کرنی پڑی۔ کیونکہ انکو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے صرف پچیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن جب انشاء اللہ خان کو دربار مین رسوخ حاصل ہوا اور وہ شاہزادہ کی غزلین بنانے لگے تو اس پچیس روپے مین بھی تخفیف ہوگئی۔ اور مشہور ہے کہ اس حالت مین انکو غربت و افلاس نے غزل فروشی پر مجبور کیا۔ اور اگر مولوی محمد حسین آزاد کی روایت صحیح ہے تو اس تجارت نے اسقدر وسعت اختیار کر لی کہ ان کے پاس دو۔ تین تختیان دھری رہتی نہین جب مشاعرہ قریب ہوتا تھا تو ان پر اور مختلف کاغذون پر طرح مشاعرہ مین شعر لکھنے شروع کر دیتے تھے۔ اور برابر لکھے جاتے تھے۔ عین مشاعرے کے دن لوگ آتے ۸ر سے ۸؍ تک اور جہان تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا یہ اس مین

سے ۱۹۔۱۱۔۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے۔ پھر سب کو دے لیکر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے۔ اور انکو مشاعرہ مین پڑھ دیتے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ مین جب شعرون پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو انہون نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہونچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہین۔ جلال کی غربت و فلاکت کی داستان اگرچہ اس قدر پر درد نہین ہے۔ تاہم رامپور سے نکلنے کے بعد ان کو بھی معاش کی طرف سے کبھی اطمینان و سکون نصیب نہین ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بغیر مالی منفعت کے کسی کے کلام پر اصلاح نہین دیتے تھے۔ اور جب تک ٹکٹ روانہ نہ کیا جائے۔ کسی کے خط کا جواب نہین لکھتے تھے۔ اس متفرق آمدنی کے علاوہ منگرول کے نواب حسین میان ان کو پچیس روپے ماہوار بھیجتے تھے اور ہر قصیدہ پر سو روپے الگ دیتے تھے۔ مین نے بھوپال مین ان کا ایک خط دیکھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ فکر معاش سے تنگ آکر حیدر آباد کی ریاست سے توسل پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یا کم از کم صلہ و انعام کی خواہش رکھتے تھے۔ اس غرض سے انہون نے نواب وقار الملک کی خدمت مین ایک قصیدہ بھیجا تھا لیکن انہون نے اسکی جو داد دی وہ غریب جلال کیلئے سخت مایوس کن تھی۔ لیکن اس فقر و فاقہ کے باوجود ان مین مصحفی کی مسکینیت نہین پائی جاتی تھی بلکہ شکستہ حال میر کی طرح نہایت خوددار اور مغرور تھے۔ اور اپنے سامنے کسی استاد کو نگاہ مین نہین لاتے تھے۔ چنانچہ مین نے سنا ہے کہ انہون نے لکھنؤ کی ایک مسجد کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ اس مسجد کی در و دیوار اور منبر و محراب کی قسم کہ آج لکھنؤ مین جلال کا جواب نہین اور اسوقت ہم ان کی شاعری پر تنقید کر کے یہ دکھانا چاہتے ہین کہ اُن کا یہ مغرورانہ دعویٰ واقعی بالکل بجا تھا۔

حکیم صاحب نے شاعرانہ حیثیت سے لکھنؤ کے اس خاندان مین تربیت پائی ہے جس نے ہمارے نزدیک شاعری کو بھانڈون کی نقل بنا دیا تھا اسوقت تاریخ کے رنگ کلام سے بحث نہین ہے لیکن اس قدر تو خود اہل لکھنؤ تسلیم کرتے ہین کہ ان کے تلامذہ مین میر علی اوسط رشک نے شاعری کو بالکل نمکدان ظرافت بنا دیا تھا۔ مثلاً یہ اشعار۔

چاول الماس، گوشت لخت جگر　　فرقتِ یار مین پلاؤ نہین

میرے کھانے سے کیون فلک ہے کباب پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہین

اونھی کی نازک خیالی کے نمونے ہین۔ اور صرف اسی پر بس نہین۔ ان کا پورا دیوان اسی قسم کے کثیف اشعار سے لبریز ہے۔ حکیم جلال پہلے انہی کے ایک شاگرد امیر علی خان ہلال کے جن کے کلام کا رنگ بہی اسی کے مشابہ ہے ؎

یہ ہاتہا پائی بھی کہین دیکھی سنی نہیں لاتون کے ساتھ آپ کی چلتی ہین کہنیان

شاگرد تھے۔ لیکن بعد کو خود ہلال ان کی قابلیت کو اپنے قابو سے باہر پا کر اپنے اُستاد میر علی اوسط رشک کے پاس لیگئے۔ اور یہ کچھ عرصہ تک اُن سے مشقِ سخن کرتے رہے۔ لیکن جب وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے۔ ان تینون خم کدون کے نچوڑ سے جو کثیف شراب تیار ہوئی تھی اوسکی نسبت خود حکیم صاحب کے ایک ممتاز شاگرد سید انور حسین آرزو نے ہم سے کہا کہ وہ ضایع کردی گئی۔ یعنی بعد کو حکیم صاحب نے اس رنگ کے اشعار کا دفتر خود ہی چاک کر دیا۔ ؎

کین دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

بایںہمہ ان کے دیوان مین بعض اشعار اب تک اس رنگ کے موجود ہین۔ مثلاً

سرعت وہی ہے گردشِ چشم کحیل کی طے کی ہے گو مسافت ابھی ایک میل کی

دیکھے جو آئینہ بھی شباب اس جمیل کا دل مین چھپے اُبھار رہا سون کے کیل کا

توڑینگے یون کہ پھر نہ ملے غیر سے وہ شوخ جس روز کوئی جوڑ ہمارا بھی چل گیا

آنکھ جھک کر نہ اُٹھی جھانکی ہین بغلین کیا کیا دل ہمارا جو کہین ان کی بغل سے نکلا

ششدر سا ہے کچھ یار بھی کچھ ہم ہی ہین ششدر بیٹھے ہین شبِ وصل عجب بارہ دری مین

بنے اس سیم تن سے یا بگڑے ہر طرح عاشقون کی چاندی ہے

سر منڈوا اے زاہد اگر ہے ریش کو منڈوا نکل آئیگی پھر داڑھی کہ یہ تو گھر کی کھیتی ہے

لیکن بایںہمہ طبیعت مین اخذ و قبول کی قابلیت خدا داد تھی۔ اس لئے انہون نے یہ روش چھوڑ دی۔ اور دوسرے راستہ پر چلنے لگے۔ خواجہ آتش کی آتش نفسیون کے نمونے سامنے تھے

ان کے تلامذہ کا صاف ستھرا عاشقانہ کلام لکھنؤ کی گلی کوچون مین عموماً پڑھا جاتا تھا۔ میر کے پر درد اشعار ذہر شاعر کے لیئے وحی والہام کا درجہ رکھتے تھے۔ لکھنؤ سے باہر انہون نے ایک مدت تک ریاست رامپور مین زندگی بسر کی۔ جو شعرائے دلی اور شعرائے لکھنؤ کا ایک مشترک مرکز تھا۔ اور ان تمام اسکولون سے متاثر ہوکر انہون نے ایک مخلوط رنگ پیدا کیا جس مین آتش، تلامذۂ آتش، اور مرزا داغ کی سلاست و روانی، شیفتہ و غالب کی متانت، اور میر کا سوز وگداز سب کچھ موجود ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کا کلام انچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری کا مصداق ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اس اصلاح شدہ کلام کو شاعری کے کس اسکول مین داخل کیا جا سکتا ہے۔ خود حکیم صاحب اپنے آپ کو میر صاحب کا مقلد بتاتے ہین۔

کہنے کو جلال آپ ہی کہتے ہین وہی طرز　　　لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات

اور اُن کے کلام مین جو سادگی، تاثیر، اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط نہین ہے مثلاً

اُٹھا کے آنکھ کو دیکھا جو دھیان سے اوپر　　　تو پایا انکو بہت لامکان سے اوپر
کہڑے تھے وہ سرِ بالین نگر نہ دیکھ سکا　　　نگہ نہ کی گئی مجھ ناتوان سے اوپر
پڑے ہین سوزِ جگر کے بیان سے چھالے　　　زبان کے نیچے، زبانہا زبان سے اوپر
اثر کو عالم بالا مین جاکے ڈھونڈلے آہ　　　جہان اک اور بھی ہے اس جہان سے اوپر
یہ قیس و وامق و فرہاد کے سب افسانے　　　گذر چکے ہین مری داستان سے اوپر
زمین سے خاکِ شہیدون کا تیرے اُٹھکے غبار　　　پہونچ گیا ہے کہین آسمان سے اوپر

جلال عشقِ حقیقی کا رہنما ہے مجاز
چڑھے ہین عاشق اِسی نردبان سے اوپر

یہ انکی ایک پوری غزل ہے۔ اور اس مین لکھنؤ کی شاعری کی نمایان خصوصیات انگیا، کرتی، کنگھی، چوٹی اور ضلع جگت، وغیرہ کا کہین پتہ نہین۔ بلکہ اس کے بجائے درد وغم اور سوز وگداز کی کافی چاشنی

موجود ہے۔ یہی ان کے کلام کا عام رنگ ہے اور اس رنگ مین انہون نے بہ کثرت بر درد اشعار لکھے ہین۔ مثلاً

تری کوئی حسرت نہ نکلیگی اے دل | یہ کہتے ہین چند اشک حسرت نکلکر
خبر تھی کسے عشق مین دل ہمارا | یہ کچھ ناز اٹھائیگا نازون مین پلکر
سر شمع پروانے گر کر پکارے | لگی دل کی عاشق بجھاتے ہین جلکر
چلو حسرتو کوئے جانان مین ہے دل | منا لائین آج اپنے روٹھے کو چلکر

نہ بلانیکا ہے شکوہ انہین ہم سے دم نزع | یہ عنایت نفس چند کے مہانون پر
اشکبار آج بھی رکھا ہمین اسنے اے چرخ | پڑ گئی اوس شب وصل کے مہانون پر

زیادہ اس سے نہ اٹھوائیگا اپنے ستم | دیا ہے آپ کو نازون مین ہم نے پال کے دل
جلال دیکھو نہ تم ہائے کہکے گر پڑنا | کسی کے ناز اٹھانا ذرا سنبھال کے دل
چلے جو دل کو وہ ٹھکرا کے یہ صدا آئی | نثار تیری ان اٹکھیلیون کی چال کے دل

بیخودون سے ترے رہتی ہے خودی کوسون دور | ہوش دیوانہ نہین آتے جو دیوانون مین

زہے قسمت جو تم اپنی گلی مین | جگہ مرنے کی دو زندگی مین
نہ پوچھوگے نہ درد دل کہون گا | یونہی رہ جائیگی بس جی کی جی مین
خیال دوست تونے کی شب ہجر | عجب بیکس نوازی بیکسی مین
فلک کیا ہمکو سمجھا ہے کوئی زخم | رولاتا ہے جو تو اکثر ہنسی مین
عدو کیسے احبا بھی ہمارے | بنے دشمن تمہاری دوستی مین

جگر، دل، سینہ، پہلو، درد تیرا — انھی مین سے ہے پوشیدہ کسی مین

یہ سچ ہے کہ لکھنؤ کی شاعرانہ خصوصیات مین وہ رعایت لفظی کو حتی الامکان ہاتھ سے جانے نہین دیتے لیکن باہمہ اُس مین شیخ ناسخ کے اسکول کی کثافت نہین پائی جاتی۔ بلکہ اس مین وہ ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتے ہین کہ یہ عیب ہنر بنجاتا ہے مثلاً

تقدیر پہ ہنسی ہماری کیا کیا — بولے جو وہ ہم سے مسکرا کر

خبر تک بھی ہوئی اک شب نہ اس خانہ نشین بت کو — در و دیوار کیا کیا میرے نالون نے ہلائے ہین

دیکھین تو کھنچے رہتے ہین ہم سے وہ کہانتک — اے جذب ترا ہم بھی اثر دیکھ رہے ہین

کیا حضرتِ دل رات کو دیکھا تھا کوئی خواب — کچھ صبح سے آج آپ پریشان بہت ہین

تپاک اے دل جو ہے سوز نہان مین — یہ دل سوزی کہان ہر مہربان مین
مری چپ کا سبب عشق بتان مین — نپوچھو آ نہین سکتا بیان مین
ہوئی نذر اسکی تیر نیم کش کی — جو کچھ باقی تھی جان اس نیم جان مین
جلا دل اس مت سے جلتا ہو ساغر — کہان وہ رات دور آسمان مین

وہ ہم ہین سوختہ قسمت کہ شعلہ رو یون مین — لگی بجھانے جب آتے ہین جل کے جاتے ہین
مجھ سے کہتی ہے یہ اک وعدہ فراموش کی یاد — دیکھ یون دل سے دو عالم کو بھلا دیتے ہین
جذبِ دل کھینچ نہ لے جائے اس اندیشے سے ہم — اُن کی تصویر کو پہلو سے ہٹا دیتے ہین

بعض اور قرائن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہون نے خصوصیت کے ساتھ میر کے کلام کو پیش نظر رکھا ہے

اور اُن کے مضامین ان کے دل و دماغ مین بہ شدت سرایت کر گئے ہین مثلاً میر کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہین

باؤلے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار   عقل کی باتین کیان کیا ہم سے نادانی ہوئی
چاہ کر اس بیوفا کو آخر اپنی جان دی   دوستی اوس کی ہماری دشمن جانی ہوئی

اور حکیم جلال نے خفیف سے تغیر کے ساتھ میر کے دونون آخری مصرعون کو لے لیا ہے اور اپنے حسنِ بندش سے اوسکو ترقی دی ہے ۔

بعد ترکِ عشق کے کیسی پشیمانی ہوئی   عقل کا کہنا کیا کیا ہم سے نادانی ہوئی
بے اجل شوقِ وصالِ یار نے مارا جلال   دوستی آخر کیسکی دشمنِ جانی ہوئی

ایک اور قرینہ یہ ہے کہ میر نے تمام صنائع و بدائع مین صنعت اضداد کا اکثر استعمال کیا ہے مثلاً

بد نہ لیجا ئیو پوچھو ن ہون تجھی سے یہ طبیب   بہ ہوا کوئی بھی اس درد کا بیمار ہنوز

لائی تری گلی تک آوارگی ہماری   ذلت کی اپنی اب ہم عزت کیا کرین گے

ایک سب آگ ایک سب پانی   دیدہ و دل عذاب ہین دونون

نقصان ہوگا اس مین نہ ظاہر کہان تلک   ہوئین گے جس زمانے کے صاحب کمال ہم

ور حکیم جلال نے بھی اس صنعت کو اس کثرت سے برتا ہے کہ ان کی کوئی غزل بمشکل اس سے مالی ہے مثلاً

مجھے دیکے ذلت وہ محفل مین اپنی   معزز کرین گے گرامی کرین گے
محبت مین دیکر تجھے جان شیرین   بہت یاد لے تلخکامی کرین گے
کہ ہر خاص جسم عنابت ہے اُنکی   بھلا کیا تمیز اس کی عامی کرین گے
خریدار اُن کے بہت گو ہین کم سِن   وہ بکتے ہین یوسف کے مولون ابھی

خواہشِ روزِ وصال آتی ہمارے آگے ‖ پڑ گئی پیچھے بلائے شبِ فرقت کیسی
عشق مین یون بھی رہا ہے کوئی ناکام کبھی ‖ رنج تک وہ ہمین دیتے نہین حسرت کیسی
اللہ اللہ مرے کینے کا اظہار ایسا ‖ اور دشمن کی چھپاتے ہو محبت کیسی
شرارت یہ اس بت مین کچھ آگئی ‖ کہ شوخی بھی واللہ شرما گئی
جو ہو رگِ جان سے بھی قریب اُس سے یہ دوری ‖ حیرت مین ہے دل تم سے جدا دیکھ کے مجھکو

بہرحال وہ اس رنگ کو اختیار کر کے لکھنؤ کے اسکول سے الگ ہو کر دلی کے اسکول مین داخل ہو گئے
چنانچہ تذکرہ بزم سخن مین ہے۔

"پیشتر سخن بروش لکھنوی گفت الحال بہ طرز دلی فکر می نماید"

اور ان معنوی خصوصیتون کے ساتھ دلی کی تمام ادائین اُن مین آگئین۔ مثلاً ناسخ و آتش کے زمانہ سے لکھنؤ مین مسلسل گوئی کا جو رواج ہوا۔ اوس کو متاخرین کے دور مین امیر اور منیر وغیرہ سب نے قایم رکھا۔ اور دوغزلہ، سہ غزلہ، بلکہ چوغزلے تک لکھنے پر بھی قناعت نہین کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل قصیدہ بنگئی۔ اور ہر قسم کے رطب و یابس مضامین ان مین بار پا گئے۔ لیکن قدمار کی تقلید مین اساتذۂ دلی ہر طرح مین صرف ایک غزل لکھتے تھے۔ اور اوس کے اشعار کی تعداد بھی محدود ہوتی تھی۔ جلال مرحوم بھی اس معاملہ مین قدمار ہی کے متبع ہین اور اُن کی غزلین بھی شعرائے دلی کے طرز پر اکثر مختصر ہوتی ہین۔ اور اشعار کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہین ہوتی۔ اور اگر کبھی طویل غزلین لکھتے بھی ہین تو دوغزلہ سے آگے نہین بڑھتے۔ اور اس کے اشعار کی تعداد بھی بہت زیادہ نہین ہوتی۔

یہان تک جو بحث تھی وہ اصولی حیثیت سے تھی۔ یعنی یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگرچہ حکیم جلال لکھنؤ مین پیدا ہوئے۔ لکھنؤ ہی مین رہے۔ لکھنؤ ہی مین شاعرانہ تربیت پائی۔ اور لکھنؤ ہی کی خاک کو ان کے مدفن بننے کا بھی شرف حاصل ہے۔ لیکن انہون نے محض اپنے ذوق سلیم سے لکھنؤ کے مبتذل شاعرانہ رنگ کو چھوڑ کر قدمار اور قدمار مین بھی میر کی یا کم از کم شعرائے دلی کی روش اختیار کی لیکن اب ہم ان کے کلام کی نمایان خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہین۔

ادلستان

(۱) قدما نے عموماً اور میر صاحب نے خصوصاً تغزل کا رنگ اختیار کیا تھا لیکن اس دور کے بعد انشاء و جرأت نے معاملہ بندی کی ابتدا کی اور اسی کے بعد لکھنؤ کی اصلی شاعری کا دور شروع ہوا۔ اس لئے قدرتی طور پر ان لوگوں نے معاملہ بندی اور وقوعہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے نہایت سخت بازاری روش اختیار کر لی۔ حکیم جلال نے بھی انہی شعرا کی آغوش مین تربیت پائی تھی لیکن تاہم انہون نے اس روش سے الگ ہو کر تغزل کا رنگ اختیار کیا۔ اور اس مین نہایت متین، با وقار اور سنجیدہ اشعار لکھے۔ مثلاً

اب تک ہین شوقِ یار مین آنکھین کھلی ہوئین　　مر کر بھی ہین مزار مین آنکھین کھلی ہوئین

حسرت یہ ہے کہ اُڑ کے پڑے اس گلی کی خاک　　رکھتا ہون کوئے یار مین آنکھین کھلی ہوئین

بے دیکھے اس کے دم کا نکلنا محال ہے　　کہتی ہین احتضار مین آنکھین کھلی ہوئین

اس مہ کے انتظار مین ہم ہین شبِ فراق　　اور اک مکان تار مین آنکھین کھلی ہوئین

تو لاکھ چاہے ہونگی نہ تا حشر اے اجل　　بند اس کے انتظار مین آنکھین کھلی ہوئین

(۲) لیکن انہون نے اس رنگ کو معاملہ بندی اور ادا بندی کے ساتھ ہی مخلوط کر لیا ہے۔ اس لئے دلی کے ساتھ لکھنؤ کی شان بھی قایم رکھی البتہ فرق یہ ہے کہ معاملہ کے اشعار مین بھی انہون نے بازاری روش سے احتراز کیا ہے مثلاً

کیا یاد آ رہی ہین کسی شوخ مست کی　　کچھ بند کچھ خمار مین آنکھین کھلی ہوئین

فتنے شبِ وصال جگایا کیے رات بھر　　کیا خوابِ نازِ یار مین آنکھین کھلی ہوئین

کیفیتین دکھا گئین انکی شبِ وصال　　وہ نیند کے خمار مین آنکھین کھلی ہوئین

پھر کفن تم اپنا دوپٹہ تو دے چکے　　چادر ہی دو کہ قبر کا وہ شامیانہ ہو

گلے کٹواتی ہین دلکش صدائین　　سنا ہے تم نہایت خوش گلو ہو

بے حجابی ہی رہے وصل مین کہتا ہے یہ کون　　جب محل شرم کا آجائے تو شرماؤ بھی

لیکن اُن کے کلام مین اس قسم کے اشعار خال خال پائے جاتے ہین۔ ورنہ ان کا عام رنگ وہی قدما
اور شعرائے دلی کا متغزلانہ رنگ ہے۔

(۳) اس رنگ کے لئے انہون نے زبان بھی نہایت لوچدار پائی ہے۔ اگرچہ مرزا داغ کی زبان مین بھی روانی و برجستگی بہت پائی جاتی ہے۔ لیکن جو نرمی، لطافت، شیرینی، اور لوچ، حکیم صاحب کی زبان مین پایا جاتا ہے وہ ان کے معاصرین مین کسی کی زبان مین نہین پایا جاتا۔ مثلاً

عرضِ مطلب مین شان جاتی ہے ۔۔۔ بات لے مہربان جاتی ہے
عشق مین آن بان جاتی ہے ۔۔۔ آن جاتی ہے شان جاتی ہے
بیمروت ہے پوری مرگِ فراق ۔۔۔ چھوڑ کر نیم جان جاتی ہے
بات تو کرنے دے ہمین ای ضبط ۔۔۔ کام ہی سے زبان جاتی ہے
شب وصل اسکی دیکھین اپنے بعد ۔۔۔ کس کے گھر مہمان جاتی ہے
روحِ عاشق بھی اسکے کوچہ کی ۔۔۔ خاک آ آکے چھان جاتی ہے
مجھکو ذلت نہ دیجئے سرِ بزم ۔۔۔ سوچئے کس کی شان جاتی ہے
لاکھ وہ چشم شوخ ہے خودرائی ۔۔۔ دل جو کہتا ہے مان جاتی ہے
شکوہ جور و ستم کا اُسکے جلال ۔۔۔ دیکھئے آن بان جاتی ہے

(۴) حسن بندش اور حسن بندش کے ساتھ اس حیثیت سے ان کے کلام مین اس قدر ہمواری پائی جاتی ہے کہ تمام اشعار ایک ہی سانچے مین ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہین۔ مثلاً

یاد آ کے ترے ہجر مین سمجھائیگی کس کو ۔۔۔ دل ہی نہین سینے مین تو بہلائیگی کس کو
دم کھنچتا ہے کیون آج یہ رگ رگ سے ہمارا ۔۔۔ کیا جانئے ادہر دل کی کشش لائیگی کس کو
جب مار ہی ڈالا ہمین بیتابی دل نے ۔۔۔ کروٹ شب فرقت مین بدلوائیگی کس کو
مرجائینگے بے موت غم ہجر کے مارے ۔۔۔ آئیگی تو اب زندہ اجل پائیگی کس کو
مدفن نہ اگر ہوگا سر راہ ہمارا ۔۔۔ اٹھیلی چال آپ کی ٹھکرائیگی کس کو

اچھا رہے تصویر کسی کی مرے دلبر — کمبخت نہ ٹھہریگا تو ٹھہرائیگی کسکو
کچھ بیٹھ گیا دل ہی یہان بیٹھکے ہنا — غیرت تری محفل سے اب اٹھوائیگی کسکو
اس وعدہ خلافی نے اگر جان ہی لے لی — پھر جھوٹی تسلی تری تڑپائیگی کسکو

کیون لینگے جلال آکے مرے دل مین وہ چٹکی
جھپکیگی پلک کاہیکو نیند آئے گی کس کو

(۵) غزل کا اصلی عنصر اگرچہ صرف عشق و محبت کے جذبات ہین، لیکن رفتہ رفتہ اس مین رندی۔ سرمستی۔ تصوف و اخلاق وغیرہ کے مضامین بھی شامل ہوگئے۔ اور اب وہ غزل کا لازمی جزو خیال کئے جاتے ہین لیکن حکیم صاحب کا کلام چونکہ اول سے آخر تک صرف عاشقانہ ہے اس لئے اس مین شراب کباب اور تصوف واخلاق کے مضامین بہت کم پائے جاتے ہین۔ اور اس لحاظ سے اساتذۂ متاخرین مین حکیم صاحب سے زیادہ کسی کا کلام مہذب، شائستہ، اور بے میل نہین ہے۔ لیکن بایںہمہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانہ نے حکیم صاحب کی قدر دانی کماحقہ نہین کی۔ کچھ تو ان کے غیر معتدل فخر و غرور نے ان کو عام نگاہون سے گرادیا۔ اور کچھ بے سروسامانی نے ان کو داغ و امیر کی طرح چمکنے کا موقع نہین دیا۔ اور انہون نے زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے ہوئے ؎

ہوئی نہ قدر کبھی یہ ملال لے کے چلے
لحد مین ساتھ ہم اپنا کمال لے کے چلے

ہمکو عاشقانہ شاعری کا بہترین سرمایہ عطا فرماکر غایت غربت و مسکینت کے عالم مین وفات پائی۔ لیکن بایںہمہ لکھنؤ اب تک اونکی ذات پر ناز کرتا ہے۔

غزل

مری ہستی تھی برق و باد کی صورت زمانے مین
نہ آنے ہی تھا آنے مین نہ جانا ہی تھا جانے مین

غمِ فردا و فکرِ دوش کی آفت سے در گذرا
جو ممکن ہو تو خود ہی محو ہو جاؤن زمانے مین

تواضعِ برق و باران کی الٰہی کس طرح ہوگی
کہ اب تو ایک تنکا ہی نہین ہے آشیانے مین

مجھے آتا ہے رونا اشکِ غم کی نارسائی پر
ہزارون آفتین ہین آنکھ سے دامن تک آنے مین

یہ کلیان دامنِ عبرت مین ہنستی ہین کہ روتی ہین
مجھے شعلہ نظر آتے ہین ان کے مسکرانے مین

جو دل کا خون بنکر چشمِ گریان سے ٹپکتے ہین
نہین معلوم کتنی حسرتین ہونگی زمانے مین

وہی صورت وہی جلوے وہی انداز دیکھینگے
وہ کھو جائین نہ خود آکر کہین آئینہ خانے مین

فقط اک آرزو اور وہ بھی صرفِ رنجِ حرمان ہو
الٰہی کیا یہی انصاف باقی ہے زمانے مین

دلِ درد آشنا کی ہستی ہی کیا تھی مگر دیکھو
یہ کاوش عشق کی اک قطرۂ خون کے مٹانے مین

اگر سچا ہے دعویٰ انقلابِ دہر کا ھادی
مری محرومیٔ قسمت بھی شامل ہے زمانے مین

(ہادی مچھلی شہری)

آہنگِ مستقبل

(منظر سیمابی صدیقی۔ اکبر آبادی)

موت آئیگی قہرِ ناگہانی ہو کر
مٹ جائینگے سب نقوش فانی ہو کر

خورشیدِ قیامت کا جو نکلا منظر
بہہ جائینگے آسمان پانی ہو کر

انسان مکینِ بزمِ فانی ہو کر
مغرور ہے صرفِ خوش بیانی ہو کر

دنیا مین رہے گا نہ کوئی اے منظر
دنیا رہ جائیگی کہانی ہو کر

زندگی کیونکر کامیاب بنائی جاسکتی ہے

(از محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف۔ بھوپالی)

اکثر نوجوان باوجود قابلیت وکوشش اکثر کامون مین ناکام رہتے ہین۔ اس کے وجوہ نفس پر قابو نہ رکھنا۔ غیر ضروری شر میلا پن۔ مردم گریزی۔ اور حد سے زیادہ خود داری یعنی غرور ہین جس شخص مین یہ کمزوریان ہوتی ہین۔ وہ اس سبب سے کہ این وآن کا نشانہ بنے کسی سے الجھنا نہین چاہتا۔ اور بجائے حرکت یعنی زندگی کے سکوت یعنی موت کو اپنی حالت پر طاری کر لیتا ہے۔

مسٹر (و۔ ل۔ جارج) ہی جو انگریزی زبان کے زبردست ادیب اور ماہر مالیات ہین ابتدا مین انہین نقائص کا شکار تھے۔ اور بعد مین طرح طرح کے تجربون اور مشاہدون کی بنا پر نقائص دور کرنے مین کامیاب ہوئے۔ حال مین انہون نے ایک مضمون مین ان برائیون سے بچنے اور رہائی پانے کی تدابیر بتائی ہین۔ ہم یہان بعض اہم مقامات کا ترجمہ درج کرتے ہین۔

دو مین ۲۲ برس کی عمر مین بڑا خود بین اور زبون احساس تھا۔ چاہتا تھا کہ میری ہر بات اور ہر رائے سامعین بلا عذر وحجت مان لین۔ ہر جنرل کو لڑائی کے متعلق مشورہ دینا۔ ہر دولت مند کو ملینون روپے جمع کرنے کا سبق پڑھانا اور ہر پاکدامن خانم کو اس کی کمزوریون پر متنبہ کرنا گویا میرا فرض عین تہا۔

سنہ ۱۹۰۲ء مین میری ایک فلاسفر سے ملاقات ہوئی حسب عادت اس کے سامنے بھی مین نے ہمہ دانی کا اظہار کیا۔ اس نے کسی قدر ناک بھون چڑھا کر کہا۔ بس بس جناب معلوم ہو گیا بیشک آپ معراج کمال پر پہونچے ہوئے اور ہر فن مولا ہین۔ مجھپر اس مضحکہ خیز فقرہ کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ مین نے جلوت کی زندگی سے قطعی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور شرمیلا پن اور مردم گریزی مجھ مین یہان تک بڑھ گئے کہ مین "استاذ رقص" بن جہان عورتین مردون کے ساتھ مصروف

رقص ہوتی ہین مین اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر نظرین نیچی کئے مارے شرم کے الگ بیٹھ رہتا۔ اور انکار فیۂ رقص کے بیہم بلانے پر بھی اس کے پاس نہ جاتا۔ اور مین حیران رہ جاتا تھا کہ اب کیا کرون آخرت خلوت نشینی سے فائدہ اُٹھا کر مین نے دماغ سوزی اور جگر کاوی کے ساتھ ایک کتاب لکھی اور ایک طابع کے پاس نقد معاوضہ لے کر کتاب چھپوانے کو پہونچا۔ لیکن شرمیلے پن کی بے معنی عادت نے اساس موضوع ہی بہلا دیا۔ اور کتاب کی خوبی عمدگی، اور ضرورت، واہمیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اور پبلشر کے ساتھ کھل کر بات چیت نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے میری لایعنی اور بے معنی باتون سے اُکتا کر ٹکا سا جواب دے دیا کہ "ہم یہ مسودہ نہین چھاپ سکتے" یہ خلاف مرضی و توقع جواب پانے پر اپنا سا منہ لیکر مین اس کے پاس سے لوٹا راستہ بھر دل ہی دل مین اپنی فروگذاشتون کو سوچتا جاتا تھا کہ مین نے اچھی طرح باتین نہین کین۔ اور اپنے مفہوم و مطلب کو ذہن نشین کن پیرایہ مین ادا نہین کیا۔ اور طابع کی دقتِ نظر کو جلب نہ کر سکا۔ آخر بہت دن تک اپنے نقائص اظہار پر غور کرنے کے بعد مین پھر ایک دن اسی طابع کے پاس پہونچا۔ اور ادہر ادہر کی باتین کرکے اسی کتاب کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور اس کے موضوع کی اہمیت پہلے سے مفصل طور پر اس کے ذہن نشین کی۔ یہ سنکر طابع نے چھوٹتے ہی کہا: بھئی واہ آپ بھی خوب ہین یہ باتین آپ نے اُسی دن کیون نہ کہہ دین؟ افسوس اب تک تو آپ کی کتاب کبھی کی چھپ گئی ہوتی" غرض مین ہمیشہ اسی طرح غیر ضروری جلد بازی سے اپنے کام الجھن مین پھنسا لیتا تھا۔

مجھ مین ایک عیب یہ بھی تھا کہ دوستون اور ملاقاتیون کی ہر مجلس مین مین کبھی دوسرون کی باتین سننا نہین چاہتا تھا۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک سب میری باتین کان لگا کر سنتے رہین میرا ہر خیال چاہے وہ کتنا ہی بودا بیہودہ پھسپھسا لچر اور لغو ہو شرف قبولیت حاصل کرے اور ہر رائے اچھی سمجھکر مان ہی لی جائے۔ میرے اس تکلیف دہ طرز عمل سے تنگ آکر آخر ایک بے تکلف دوست نے کہہ مارا کہ "مسٹر جارج آپ تو یہی چاہتے ہین کہ تمام باتین آپ ہی کرتے رہین۔ اور دوسرے قوت ناطقہ سے مستغنی ہوکر آپ کی اوٹ پٹانگ باتین

سنتے رہیں"۔ مجھ پر اس زہرخند کا بڑا اثر ہوا میری آنکھیں کھلیں اور میں نے اپنے نفس کو بڑی ملامت کی۔ اور میں سمجھ گیا کہ ابھی نتیجۂ مطلوب حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس لئے قوی عزم کیساتھ ان ناگوار حالات کے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ سب سے پہلے شرمیلا پن دور کرنے کی کوشش کی۔ اور مجھے تحقیق و تدقیق سے معلوم ہوا کہ مردم گریز اور شرمیلے لوگوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو مچھلی کی طرح خاموش اور بے زبان ہوتے ہیں۔
دوسری قسم میں وہ تمام بکّی لوگ داخل ہوتے ہیں جنکی بکواس اور چَرچَر مسلسل اور متصل ہوتی ہے۔ سننے والا ہمہ تن منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی کبھی گفتگو میں ذرا سا فصل پیدا ہو تو میں باتیں شروع کروں۔ مگر غریب کو ایسا موقع میسر ہی نہیں آتا۔ تیسری قسم دونوں قسموں سے ہی بدتر ہے۔ اس کی تعریف میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی محجوبیت چھپانے کو کبر و غرور، نخوت و دنائت۔ ڈانٹ ڈپٹ۔ تخفیف و توہین سخت کلامی اور درشت زبانی سے کام لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارا اختیار و اقتدار مان کر تمام لوگ اپنی بے رعبی، بے عزتی، مجبوری، اور بے علمی کا زبان حال سے اعلان کر دیں۔ مجھ میں ہر سہ اقسام کے اشخاص کی برائیاں مجتمع تھیں۔ جو میری جبلت (کیرکٹر) کے سفید دامن پر کالا دھبہ نظر آتی تھیں۔ آخر تنہائی میں بہت دنوں سوچ بچار کے بعد چند تدابیر کا علم ہوا۔ جن پر عمل کر کے میں اس ذلیل عادت سے مخلصی پا سکا۔

یہ تو آپ کا بھی تجربہ ہوگا کہ جب کبھی آپ کسی بڑی تجارت گاہ میں جاتے ہیں تو وہاں ملازمہ خادمہ اور بیچنے کی خدمت پر متعین خوبصورت حسین و جمیل اور نوجوان عورتیں نظر آتی ہیں جو نہایت قیمتی ریشمی اور نازک لباس پہنے رنگا رنگ کی زینت و تجمل کے ساتھ خریداروں کو مجذوب و مسلوب کرنے کا کام کرتی اور ایسی محبت بھری تیز نظریں ڈالتی ہیں کہ انسان مبہوت محجوب اور ہکا بکا رہجاتا ہے۔ اور اس کے خون میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ انہی باتوں کو سوچ کر میں کبھی کسی تجارتی کوٹھی میں نہیں جاتا تھا اور کیسی ہی ضرورت ہو یا احباب کتنا ہی مجبور کریں میں ہمیشہ ہچکچاتا اور گھبراتا تھا۔ لیکن میں نے ان حالات پر غالب آنے کے لئے بے ضرورت بھی ایسے مواقع پر جانے کی ٹھانی۔

ایک بڑا تجارت خانہ میرے مکان کے قریب ہی تھا۔ مین نے سویرے سے جبکہ ایک بھی خریدار نہ آنے پائے کسی معمولی چیز مثلاً کھلونا خریدنے کے بہانے سے وہان جانا شروع کیا اور دختران مستخدمہ کے سامنے سے گذر کر جو سب کی سب دلربا، متحرک بجلیان، شیک، لطیف، خوشرو، خوش مو۔ خوش گو اور ہنس مکھ تھین انتہائی بے اعتنائی اور بے پروائی کے ساتھ وہ چیز خرید کر لوٹتا۔

اس کارگر تدبیر سے میرا غیر ضروری شرمیلاپن، مجروح اور منہزم ہونے لگا۔ میرا یہ اقدام تین شقون سے مرکب تھا۔ اول یہ کہ گوناگون بجلی کی طرح تیز نظرون کے سامنے بے پروا چلنا دوسرے نوجوان ہونے کے باوجود بچون کا کھلونا خریدنے کھلونا بیچنے والون کے پاس جانا۔ تیسرے دو چار سوٹ خریدنے کو نہین بلکہ نہایت حقیر اور معمولی چیز مول لینے کو اتنے بڑے مغازہ (میگزین) مین جانا۔ جس کی قیمت آٹھ آنہ بارہ آنے سے زیادہ نہین ہوتی تھی۔

مگر پہلے دن جب مین تجارتی کوٹھی مین داخل ہوا تو ماحول سے اتنا متأثر اور افتادہ ہو گیا تھا کہ گویا میرے حواس معطل، اعضا شل، اور دماغ مختل ہو گیا ہے۔ اور مجھے انتہا درجہ کی تکان، بوجھ اور گرانی محسوس ہوتی تھی۔ مگر آزادانہ روزانہ جانے کی مشق سے رفتہ رفتہ موانعات اور رکاوٹون مین کمی معلوم ہونے لگی۔ اور خدا خدا کر کے اپنے عمل سے اس قابل ہو گیا کہ خوبصورت اور نوجوان لڑکیون کے مسکراتے ہوئے نازک ہونٹون اور محبت آمیز نگاہون کی ذرہ برابر پرواہ نہین کرتا تھا۔ بلکہ ان کے جواب مین برابر اُن کی آنکھون سے آنکھین لڑاتا اور نیم خندہ ہوتا تھا جس سے گونہ انکی تسکین ہوتی تھی

اوپر مین مجلس رقص مین اپنے شرمیلے پن کا واقعہ ذکر کر چکا ہون واقعی مین اس موقع پر چند منٹ تک ایک کونے مین اس طرح بے حس و حرکت کھڑا رہتا تھا کہ رفیقۂ رقص کو بھی نہین بلا سکتا تھا۔ اور نہ اُس کے بلانے پر اُس کے پاس جاتا تھا۔ مگر بعد مین رفتہ رفتہ یہ حالت دور ہوئی اور یہان تک نوبت پہونچی کہ ناچ گھر کے بڑے کمرے مین آزادانہ راہ چلتا۔ اور انتہائی بے پروائی سے اپنے جوتے کے بند عین ناچ گاہ ہی مین باندھتا تھا۔

میرا لباس و قیافہ بھی منتظم و مرتب حالت مین نہ تھا۔ اور مہمانی (پارٹی) کی بعض مجالس

ادلیستان

مین ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ ایک دن ایک مہمان نے خدمت گار سمجھکر مجھے حکم دیا کہ "میرے لیئے ایک فنجان چار لاؤ"۔ مین نے اس مرض کا اس طرح علاج کیا کہ روزانہ بڑے مہمانخانہ یا اور کسی مہمان خانہ مین جا بیٹھتا اور ایک فنجان قہوہ بے قیمت ملنے تک بیٹھا رہتا کبھی آس پاس کے لوگ میرے متعلق آپس مین بات چیت کرتے کہ "یہ بیچارہ بالکل مفلس معلوم ہوتا ہے۔ روپیہ نہ ہونے سے شمپین کا پیک نہین پی سکتا۔ اس لیئے غریب قہوہ ہی پی لیتا ہے"۔ اس گفتگو سے متاثر ہو کر مین نے کئی بار انہین تیکھی اور کڑی نظرون سے گھورا کہ وہ لوگ جھینپ اور سہم گئے۔ اور پھر جسارت نہ کر سکے۔

غرض اسی قسم کی لگاتار کوشش سے بتدریج مین اپنے نفس پر فرمانروا ہو گیا مجھ سے غیر ضروری شرم دور ہو گئی۔ اور اس قابل ہو گیا کہ ہزارون آدمیون کے مجمع مین تقریر کر سکون اور لکچر دے سکون۔

اس نوبت پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہر چند مجھ سے تمام برائیان دور ہو گئی ہین لیکن ابھی ایک زبردست بات حاصل نہین ہوئی۔ جو ہر قسم کی کامیابی حاصل کرنے کے لیئے سب سے ضروری چیز ہے اور وہ یہ کہ اعتدال وادراک کے ساتھ ہمہ وقت اپنی آپ کی نگہداری کرنا۔ یعنی جس ضرورت کے لیئے کسی سے باتین کرین پہلے اس کے موضوع کو ایک نوع پر دماغ مین جمع کرین...... اور پھر اس امر پر غور کرین کہ یہ موضوع مخاطب پر کیا تاثیر کرے گا۔ اور ہمین کس اسلوب اور انداز اور پیرایہ مین یون چاہیئے۔ تاکہ مطلب حاصل ہو۔ اس عمل پر قادر نہ ہونے سے میرے بہت سے سودمند کام غیر ضروری عجز وانکسار بلاوجہ کی شتاب کاری، بیجا مدح وثنا اور ناجائز خوشامد وچاپلوسی کی بنا پر برباد وخراب ہو گئے۔ اور فرصت فوت ہو گئی۔

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہین جو کسی سے کچھ مانگنے اور مطلب کہنے کے دوران مین اپنی حالت ایسی ذلیل وحقیر بنا لیتے ہین۔ جیسی اس کتے کی ہو جاتی ہے جس پر لاٹھی پڑنے والی ہو اور وہ مارے دہشت کے سہم کر زمین گیر ہوا جاتا ہو۔

اکثر لوگ ایسے بھی ہوتے ہین جو کسی محکمہ مین نوکری یا کسی کارخانہ مین مزدوری کرنے جاتے

ہین تو بغیر سوچے سمجھے یا جان بوجھ کر ہر کام کرنے کی ذمہ داری لیتے اور اقرار کرتے ہین چاہے وہ کام ان سے نہ بنے یہ طریقہ شرمندہ کرنیوالا ہے۔ جو کام جس حد تک جانین اسی حد تک اظہار کرنا چاہئے

مین دوسری قسم کے آدمیون مین تھا۔ اسی اثنا مین ایک دن مین دوسرا مسودہ لے کر ایک اور طابع کے پاس پہونچا کہ کچھ معاوضہ لیکر چھپنے کو دیدون۔ اور اس لئے کہ طابع یہ سودا کرلے مین پانچ منٹ تک اپنے فکر و ذکاوت اور علم و مکتسبات کے متعلق باتین کرتا رہا۔ مطبع والا ڈھلے ہوئے لوہے کے بت کی طرح بدون حرکت بیٹھا ہوا میری باتین سنتا رہا۔ اور گفتگو ختم ہونے پر نہایت نرم لہجہ اور باریک آواز مین جواب دیا کہ "مسٹر جارج مین آپ کا بہت ممنون ہون لیکن اب مہربانی فرماکر تشریف لیجائیے کیونکہ آپ کی ایک بات بھی میری سمجھ مین نہین آئی۔ آخر آپ کا مقصود کیا ہے؟ یہ گفتگو میرے لئے تازیانۂ عبرت و بصیرت ثابت ہوئی اور بہت دیر سوچنے کے بعد آخر مین اس نتیجہ پر پہونچا کہ " انسان جب کوئی غرض و مطلب لے کر کسی کے پاس جائے تو اُسے اسطرح بیدار، ہوشیار، چوکنا، اور خبردار رہنا چاہئے۔ جیسے ایک لایق و تجربہ کار وکیل جو کسی خونی کے بچانے اور چھڑانے کو بھری عدالت مین بہرصورت پوری طاقت کے ساتھ مستعد اور آمادہ رہتا ہے۔ اور موکل کی مدافعت مین کوئی کسر اور کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھتا۔ جو بات کہی بنی، تلی، جچی، سلجھی، ہوئی۔ حسیات شخصی اور خود بینی مطلق دور کردے۔ اور صرف اصلی اور ضروری مطالب مجمل اور موثر طور پر ازروئے عقل و حکمت مخاطب کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے۔

عام پابندئے اوقات اور وقت کا بیجا صرف بھی انسان کو اپنے نفس پر حاکم نہین ہونے دیتا اور تجربہ نے یہ بات بھی سکھادی ہے کہ جو انسان اپنے کامون کے لئے اوقات معین نہین کرتا تو بغیر جانے اور سمجھے ہوئے وقت کا خون کرتا رہتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا مگر یہ عادت ایک لڑکی نے چھڑائی۔ قیام نیویارک کے دوران مین ایک حسین و جمیل لڑکی بدھ کے دن میرے ناخن کاٹنے آتی تھی۔ مین سال بھر تک ٹھہرا رہا۔ مگر ایک مرتبہ سے زیادہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا کہ یہ لڑکی جس وقت اور منٹ پر آتی تھی اُس سے ذرا پچھلی ہو۔ مجھے اُس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا

کہ وہ روزانہ سینکڑون لوگون کے مکان پراسی ترتیب اور قاعدہ سے جاتی ہے۔ اور اس مین کبھی فرق نہین پڑتا۔ مین یہ حقیقت معلوم کرکے حیران رہ گیا۔ اور مین نے بھی اپنے تمام کامون کے لئے اوقات مقرر کرکے پابندی کی کوشش کی۔

رنگ مجاز

(مشاعرۂ بمبئی کی ایک غزل)

(از منیر الہ آبادی)

مصرعہ طرح :- آج سناٹا پڑا ہے خانۂ زنجیر مین

دل سے جب فرہاد کی یاد بہت بلے بیر مین
جو صدا نکلی وہ نکلی ڈوب کر تاثیر مین

چل بسا وحشی تراشا پد سوئے ملک عدم
آج سناٹا پڑا ہے خانۂ زنجیر مین

راز یہ اب تک نہ کوئی فلسفی حل کرسکا
جلوہ فرما کون ہے اس خاک کی تصویر مین

درد کہتے ہین جسے دونون مین وہ جوہر نہین
اُنکے سنگین دل مین میری آہِ بے تاثیر مین

تجھ یہ ہوتے ہم فدا کیون شمع و پروانہ وار
گر کشش ہوتی نہ تیرے حسنِ عالمگیر مین

دفن کرکے مجھکو فرمایا کہ سوجا! چین سے
آج سب کچھ ہوچکا لکھا تہا جو تقدیر مین

مرنیوالا حسرت دیدار لیکر چل بسا
موت کی تعجیل مین اور آپ کی تاخیر مین

ہوسکا تم سے نہ کار آخرت کچھ ہی منیر
عمر بھر الجھے رہے دنیا کی دار وگیر مین

نازنین جاسوس

(از مولانا فطرت۔ انصاری)

باب ۲ دوم

(گذشتہ سے پیوستہ)

قریب کی سڑک پر ایک ٹیکسی جارہی تھی۔ خاتون نے نہایت احتیاط سے اس موٹر ڈرائیور کو ٹھہر جانے کا اشارہ کیا۔۔۔ موٹر ٹھہر گئی اور خاتون اُس مین بیٹھ گئی۔۔۔ بیٹھتے ہی خاتون نے موٹر ڈرائیور کے کان مین کچھ کہا۔ اور موٹر شمالی جانب کو ہوا ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔ چارلس کے اوسان خطا ہوگئے۔ چارلس نے دیکھا کہ اب یہ خاتون ہاتھ سے نکل گئی۔۔۔۔۔۔ چارلس ہکا بکا سا ہوکر ٹھہر گیا۔ ابھی اسکو ٹھہرے ہوئے ایک منٹ بھی نہین گذرا ہوگا کہ پاس سے ایک اور خالی موٹر گذری۔۔۔۔۔ چارلس نے فوراً اُسے ٹھہرایا اور اس مین سوار ہوکر ڈرائیور کو سامنے کی موٹر کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔۔۔۔۔۔۔۔

خاتون کی موٹر پہلے تو ریجنٹ روڈ کی طرف گئی لیکن فوراً ہی واپس پلٹی۔۔۔۔۔۔۔ مگر واپسی کا راستہ وہ نہین تہا جس پر گئی تھی۔۔۔۔۔ چارلس نے ڈرائیور سے رفتار تیز کر دینے کو کہا اور اب چارلس کی موٹر خاتون کی موٹر کے بالکل قریب پہونچ گئی۔۔۔۔۔۔ جاتے جاتے خاتون کی موٹر ایک مکان کے پاس رک گئی چارلس نے اپنی موٹر کی رفتار دہیمی کروادی۔۔۔۔۔۔ وہ خاتون موٹر سے اتری اور ادہر ادہر دیکھ کر سڑک کے موڑ کی طرف دوڑی۔ چارلس نے یہان پہلی مرتبہ اس عورت کے قدوقامت کو اچھی طرح دیکھا۔۔۔۔۔۔۔ سڑک کو طے کر کے خاتون موصوفہ ایک چار منزلہ مکان مین داخل ہوگئی۔ چارلس بھی ڈرائیور کو چار جزدے دوا کر پیچھے ہولیا۔ خاتون تو اس مکان کا زینہ طے کرنے مین مصروف ہوگئی اور چارلس اس مکان کے دروازے مین داخل ہوتے ہی اس کے زینے کے نیچے ہی دبک گیا۔ اور خاتون کے قدمون کی آواز سے اس امر کا اندازہ کرتا رہا کہ یہ جاتی کونسی منزل پر ہے۔۔۔۔۔۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ

بالائی منزل پر گئی ہے...... اور ساتھ ہی اسکو تالے مین کنجی کے ڈالنے اور قفل کے کھولنے کی آواز بھی سنائی دی...... دروازہ کے کھلنے اور پھر بند ہو جانے کا بھی اندازہ اس نے لگایا........ اور اب معلوم ہوا پورے مکان مین سکون سا ہو گیا ہے۔

باب ۳ سویم

دروازہ بند!

چارلس اب اپنی کمین گاہ سے نکلا اور پولے پولے قدم رکھتا ہوا نہایت احتیاط سے چوتھے مالے پر پہونچ گیا۔ رات کا وقت! ۳ بجے کا عمل!! اجنبی آدمی!!! اسپر چارون طرف سے اندھیرا چارلس پہلے تو حیران ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازے کی دراڑ سے روشنی کی جھلک معلوم ہوئی اس روشنی کی مدد سے وہ چپکے چپکے دروازہ کے پاس گیا اور چٹخنی کو پکڑکر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا...... دروازہ کھولنے کی کوشش بیکار تھی..... اسے معلوم ہو گیا کہ دروازہ اندر سے مقفل ہے..... چارلس کو اسی اثناء مین کمرہ کے اندر سے خاتون کی نقل و حرکت کی آواز آتی رہی...... لیکن دروازہ کھلنے کی کوئی تدبیر سمجھ مین نہین آتی تھی۔ آخر اسکی نظر ایک کھڑکی پر پڑی جو دروازہ کے اوپر تھی۔ چارلس اُس پر چڑھنے کے لئے اُچکا اور اچھل کر رہگیا۔ کیونکہ کھڑکی مین لوہے کی مضبوط اور تیز سلاخین لگی ہوئی تھین۔ آخر چارلس اس مرتبہ بھی یہ کہکر خاموش ہو رہا کہ "افسوس اس مین بھی کامیابی نہ ہوئی......" لیکن چارلس اس سے بددل نہوا اور اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ کھڑکی لوہے کی سلاخون سے بند تھی۔ چارلس نے ایک سلاخ پکڑ کر ہلائی تو اتفاق کہئے یا اوسکی رستمی کی بدولت وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ اس سے اسکی ہمت اور بڑھ گئی۔ اور سلاخ کے دوسرے سرے کو بھی نہایت زور سے ہلانا شروع کیا۔ غرضکہ چارلس کو محنت اور وقت تو کافی صرف

کرنا پڑا لیکن ایک سلاخ کے نکال لینے مین کامیاب ہوگیا۔ چارلس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اس تنہائی اور بے کسی کے عالم مین اب وہ لوہے کی ایک سلاخ سے بھی مسلح ہوگیا۔۔۔۔۔،

سلاخ نکالکر چارلس دروازہ کی طرف بڑھا اور دروازہ کے دو کواڑون کے درمیانی سوراخ مین اسے ٹھونس دیا۔ اور دو تین مرتبہ خوب زور سے ادھر اُدھر جھنجھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قفل کی میخین نکلین اور تالے کے جوڑ تڑ تڑ ٹوٹنے لگے۔ تالے کا ٹوٹنا تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اور چارلس کا دل دھڑکنے لگا۔ اب وہ خوف کے مارے اس کھلے ہوئے دروازہ کے سامنے چپ کھڑا ہوگیا۔ اور سوچنے لگا کہ کہین اندر والون نے تو اسکی آواز نہین سنی۔ چارلس نے دل مین اپنے کام کی خطرناکی کو محسوس کیا اور کہنے لگا کہ "رات کے وقت اور پھر تنہا ایک اجنبی جگہ مین قفل توڑنا یقیناً مصائب و مشکلات کا ایک نیا باب کھول دے گا۔ مجھ جیسے شریف الطبع انسان کے یہ کام نہین ہوا کرتے۔ یہ تو چورون اور ڈاکوؤن کا کام ہے۔ افسوس مین نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اس بلا مین پھنسایا۔۔۔۔۔۔۔۔"

اگرچہ اِن خیالات نے چارلس کو سراسیمہ بنا دیا تھا تاہم وہ کمرے مین داخل ہونے کے مصمم ارادے سے باز نہ آیا۔ اور پھر بھی اندر گھسنے کی ٹھان لی۔ ابھی وہ دروازہ پر کھڑا ہی تھا کہ اس نے اندر سے کسی کھڑکی کے کھلنے کی آواز سنی۔ اور کسی کے چلنے کی آواز بھی اُسے محسوس ہوئی۔ چارلس فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی نازنین خاتون ہے جس کے تعاقب نے اس کے سامنے لوہے کو موم بنا دیا ہے۔ بہرحال چارلس نے اب دروازہ پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی سلاخ کو زمین پر ٹیک کر کھڑکی تک پہونچا۔ اور کمرہ کے اندر آنکھین پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ اس مین کیا کیا چیزین رکھی ہین۔ (باقی باقی)

رباعیات

(از بدر الدین صاحب بدرؔ - بمبئی)

فاعتبروا یا اولی الابصار

رکھ یاد کہ اک روز تجھے مرنا ہے
اسباب یہاں کا یہیں سب دھرنا ہے
کر کوچ کا سامان اے مسافر کہ تجھے
اس منزلِ فانی سے سفر کرنا ہے

مجرم ہے کوئی اور کوئی فریادی ہے
بربادی کہیں اور کہیں آبادی ہے
اے بدرؔ یہ دنیا کی دورنگی دیکھو
ماتم ہے کہیں اور کہیں شادی ہے

ایک دن جانا ہے سب کے لئے زیرِ تربت
چھوڑ کر اپنے عزیز اور یہ مال و دولت
اس لئے ایک نظر جانبِ گورستان کر
یہ وہ جا ہے جسے کہتے ہیں مقامِ عبرت

قطع برنگ میر

(از مسٹر عکس)

دکھا کے نامۂ اعمال پوچھتا ہے مجھے
وہ کارساز کہ تیرے یہ کام ہیں کہ نہیں
بچھائے آنکھیں خموشی جان کہے ہر مری
ترے کریم - و رحیم - حی - نام ہیں کہ نہیں

احساس گناہ

(مترجمہ مولانا محمد حنیف صاحب۔ندوی)

مجھے ایک دوست سے محبت تھی۔ وہ ایک قابل ادیب تھا اور شاید اس لئے میرے تعلقات اس سے گہرے تھے، ورنہ اُسکی اخلاقی حالت زیادہ بلند نہ تھی، اُسے دیکھ کر دل انبساط و سرور کے جذبات سے بھر جاتا تھا۔ یہی ایک چیز تھی جو میرے لئے بیحد جاذب اور دلکش ثابت ہوئی، اور یون بھی مین اس کے سوا اور چاہتا ہی کیا تھا؟

ایک زمانہ تک ہم اکھٹے رہے، زندگی کے یہ دن بڑے مزے سے کٹے، لیکن ہماری یہ رنگ رلیان زیادہ دیر نہ رہ سکین، مین لکھنؤ سے دلی چلا گیا، چند دن اُن سے خط و کتابت بھی رہی، پھر نہ معلوم کیون یہ سلسلہ ٹوٹ گیا، مجھے اس کا بہت قلق ہوا، اور مین نے ارادہ کر لیا کہ کہین نہ کہین سے اُسے ڈھونڈھ ہی لاؤنگا، بہتیرا سر پھوڑا، ایک ایک شہر چھان مارا لیکن وہ نہ ملنا تھا نہ ملا، اس ناکامی پر مجھے جتنا بھی افسوس ہوتا کم تھا، اُس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ مدتون سے اُس نے گھر چھوڑ دیا ہے، ایک مدت تک بیم و رجا کی کشمکش مین مبتلا رہا، آخر الامر یقین ہو گیا کہ وہ اس دنیا مین نہین، اب اُس سے ملنا دشوار ہی نہین ناممکن ہے۔

اس یقین کا آنا تھا کہ دل بھر آیا، خون کے آنسو رویا اور خوب رویا، معلوم ہوا آج سے مین بے یار و مددگار ہون، میرا گھر ایک عزیز ترین دوست سے خالی ہو گیا، اور ہمیشہ کیلئے خالی ہو گیا، اب مین ہون اور زمانہ کے المناک مصائب۔

اتفاق سے ایک دن مین اپنے گھر آ رہا تھا، راستہ بھول گیا، کیونکہ رات غیر معمولی طور پر تاریک تھی، اس خوفناک تاریکی نے مجھے ایک نہایت تنگ اور تاریک گلی مین ڈالدیا، جس پر جنون کے مسکن کا گمان ہو رہا تھا، معلوم ہوتا تھا، یہ گلی نہین بحر اسود دونون پہاڑون

کے درمیان موجین مار رہا ہے، اور مجھے اپنے تاریک سیلاب مین بے اختیار بہائے لئے جا رہا ہے
اسی اثنا مین مین نے ایک دلسوز چیخ سنی جو غالباً ان غیر آباد گھرون سے آرہی تھی۔ مین جستجو ہی مین تھا کہ دوسری چیخ نے پھر مجھے چونکا دیا۔ اس کے بعد چیخون کا ایک اندوہناک تسلسل قایم ہوگیا، جس سے پرسکون فضا مین ہلچل مچ گئی، اور یہ خوفناک سکوت سامعہ پاش آوازون سے تبدیل ہوگیا، اب مین بے اختیار ہوگیا، دل رحم و مروت کے گوناگون جذبات سے لبریز ہوگیا، اور ایک حسرت انگیز آہ کے ساتھ بے ساختہ یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے کہ "اُف یہ تاریک رات اپنے اندر کس قدر المناک راز پنہان رکھتی ہے"

اس سے پہلے مین عہد کرچکا تھا کہ مصیبت زدہ لوگون کی اعانت مین حتی الوسع کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرونگا، چنانچہ مین نے ہمت کی اور اس مکان تک پہنچ گیا، جہان سے یہ آہ و بکا کی درد انگیز آوازین آرہی تھین، دروازہ کھٹکھٹایا، اور جواب نہ پانے پر پھر زور سے دوسری دفعہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھل گیا، ایک دوشیزہ ٹمٹماتا ہوا چراغ لیکر نکلی، عمر دس سال سے زیادہ نہ ہوگی، کپڑے پھٹے ہوئے تھے، لیکن گستاخ حسن اور شوخ نور ایسے اٹھکھیلیان کرتا ہوا چھن چھن کے نکل رہا تھا، گویا ماہِ دو ہفتہ تھا جو سیاہ اور منتشر بادلون مین ضیاء افشانی کر رہا تھا، مین نے پوچھا کوئی مریض کراہ رہا ہے، اس نے کہا ہان میرا باپ ہی زندگی کے آخری لمحے گذار رہا ہے، وہ روتی ہوئی لوٹی مین بھی پیچھے ہولیا، ایک تنگ و تاریک کوٹھری تک ہم پہنچ گئے، اس کا دروازہ بہت چھوٹا اور مستتر تھا، مین نے یک بیک محسوس کیا کہ مین کسی دوسرے عالم مین ہون، یہ کوٹھری نہین قبر ہے، مریض نہین لاشہ ہے، اس کے قریب ہی مین بیٹھ گیا۔ کمزوری سے یہ ڈھانچ ہوکے رہ گیا تھا، جس مین زندگی برائے نام کچھ لمحون کے لئے مقید کردی گئی ہو، شانہ پر ہاتھ رکھا تو اُس نے آنکھین کھول دین، اور غور سے دیکھنے لگا، پھر ہونٹون مین سے ایک نحیف آواز نکلی کہ "خدا کا شکر ہے میرا دوست اس آڑے وقت مین میرے پاس ہے" میرا دل دیوانہ وار ہلنے لگا، مجھے معلوم ہوگیا یہ میرا وہی دوست ہے

جس کی تلاش میں میں مدتوں سرگرداں رہا۔ لیکن کاش میری کوششیں ناکام رہتیں میری قسمتِ خوابیدہ بیدار نہ ہوتی، اور میں اپنے عزیز دوست کو اسوقت نہ دیکھتا جب وہ ہمیشہ کے لئے مجھسے جدا ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا آپ ایسی نازک حالت تک کس طرح پہونچ گئے؟ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا میں سمجھ گیا، وہ بیٹھنا چاہتا ہے۔ میں نے ہاتھ کا سہارا دیا، وہ بیٹھ گیا، اور بمشکل اپنا دردناک قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔

"دس سال ہوئے میں اور میری والدہ ایک مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس کے ساتھ ہی ایک عظیم الشان قصر تعمیر تہا۔ جسے اپنے اندر ایک معصوم مگر بلا کی حسین دیوی رکھنے کا فخر حاصل تھا۔ میں اس پر مفتون ہوگیا۔ کیونکہ مجھے اس سے زیادہ خوبصورت عورت دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بہتیری کوششیں کیں مگر ناکام رہا۔ اس نے ہر دفعہ مجھے ٹال ٹال دیا آخر ایک فریب دیکر میں نے اُسے قبضہ کر لیا۔ آپ سمجھے وہ فریب کیا تہا وہ شادی کا لالچ تہا۔ اب وہ میرے قبضہ میں تھی۔ میں نے ایک ہی دن میں اس سے اُسکی معصوم شرافت اور معصوم دل کو چھین لیا۔ لیکن یہ شرمناک مصاحبت کچھ ہی دنوں کے لئے تھی۔ اور جب حالات معمول سے متجاوز ہوئے تو اُسے چھوڑ چھاڑ یہاں آکر رہنے لگا۔ جہاں تم مجھے اب دیکھ رہے ہو۔ پھر اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اسی مکان میں رہتے ہوئے مجھے کئی سال ہوگئے اور پچھلے واقعات مجھے خواب و خیال نظر آنے لگے۔ ایک دن ڈاکئے نے آکر یہ لفافہ دیا" یہ کہکر اس نے تکیہ کے نیچے سے ایک پرانا لفافہ نکالا جسکو امتداد زمانہ نے زرد کر دیا تہا۔ میں نے اُسے کھولا تو حسب ذیل سطور ثبت تھیں۔

"اگر میرا ارادہ اس خط لکھنے سے تجدید عہد یا دیرینہ محبت کو یاد دلانا ہوتا تو میں یقیناً ایک حرف نہ لکھتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، تمہاری جھوٹی اور ہوسناک محبت اس قابل ہی نہیں کہ اسکی قدر کی جائے۔ تم جانتے ہو تم نے مجھے کس وقت

چھوڑا؟ اسوقت جب مین تمہاری بوالہوسی کا ایک خطرناک عملی نتیجہ دیکھنے والی تھی...... تم بھاگ گئے۔ اسوقت مین جس کے اصلی سبب حقیقت مین تم ہی تھے! ہان تم مجھسے اسوقت علیحدہ ہوئے، جب مین طوفان اشک مین گھری ہوئی تمہین مدد کے لئے بلا رہی تھی۔ نہین نہین تم ہی تو وہ طوفان تھے۔......................"

اس کے بعد مین کیا تمہین کوئی شریف النفس انسان تصور کر سکتی ہون۔ بلکہ کیا تم انسان کہلانے کے بھی قابل ہو؟ حسن اتفاق سے تم مین وہ تمام صفات ایک ہی وقت جمع ہو گئی ہین جو فرداً فرداً ہر خوفناک درندے مین پائی جاتی ہین۔

تمہارا یہ دعوای محبت سراسر جھوٹ تھا۔ تمہارے ایسا ہوسناک آدمی صرف اپنے پست جذبات سے محبت کر سکتا ہے۔ جب تم نے دیکھا کہ مین ہی تمہاری بوالہوسی کی شکار ہو سکتی ہون تو تم نے مجھے اپنا بنانا شروع کیا۔ ورنہ تمہاری مجال تھی کہ میرا معصوم چہرہ ابدالآباد تک بھی دیکھ سکتے؟ تم نے مجھ سے بددیانتی اور وعدہ خلافی کی اور نکاح سے صرف اس لئے گریز کیا کہ مین اپنے دامن عصمت کو آخر تک محفوظ نہ رکھ سکی لیکن تم جانتے ہو تمہین۔نے مجھے اس پر مجبور کیا۔ اور مین تمہارے ہی لئے ذلیل ہوئی مین نے تم ہی کو خوش کرنے کے لئے اتنی بڑی خطرناک جرأت کی جس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ میری بے بسی ایسی ہی، ہے جیسے قوی ہیکل خونخوار انسان کے سامنے ایک طفل شیرخوار کی! تم نے میری عزت و شرافت کو غصب کر لیا۔ میری زندگی اجیرن کر دی۔ موت کے دن گنتی ہون، پر وہ ختم ہونے کو نہین آتے۔ تم ہی بتاؤ کیا ایسی عورت زندگی کو خوشگوار طریقے پر گذار سکتی ہے۔ جو نہ کسی کی مان ہو نہ چاہیتی بیوی، نہ اُسے کوئی سوسائٹی قبول کرنیکو تیار ہو، اور نہ وہ اس قابل رہے کہ کسی انسانی اجتماع مین شریک ہو سکے، ہان جو ہر وقت کرب و اضطراب کے بحر مواج مین غوطہ زن رہے، جس کی آنکھین ہر وقت اشک باری مین مصروف رہین۔ جس کی ہر رگ و پے مین درد سرایت کر گیا ہو، اور

طعنہائے دلخراش اسپر نمک پاشی کا کام دے رہے ہون۔

آہ! میرے آرام وطمانیت کو بھی تم نے چھین لیا، کیونکہ تمہارے بھاگ جانے کے بعد مین ماں باپ اور اعزا کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی، اور ایک نہایت ہی ذلیل اور ادنے درجہ کے مکان مین آگئی۔ تاکہ زندگی کے یہ المناک دن اس تاریک اور تنگ مکان مین گذار دون

آہ! تم نے میرے ماں باپ کو بھی زندہ نہ چھوڑا کیونکہ وہ رسوائیون کے غم مین زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے، اور آہ! میری زندگی کا فانوس بھی تمہاری اور صرف تمہاری وجہ سے ٹمٹما رہا ہے اور عنقریب گل ہونے کو ہے، کیونکہ وہ زہریلے گھونٹ جو مین نے تمہارے ہاتھون پیئے تھے پوری طرح سرایت کر چکے ہین۔ اب میری زندگی محال ہے۔ میری شمع حیات شمع سحری کیطرح جلد جلد تمام ہو رہی ہے اور شاید خدا نے میری دعاؤن کو سن لیا ہے۔ عنقریب ہی ان تمام مصائب سے چھٹکارا پانے والی ہون۔

تم مکار ہو۔ جھوٹے ہو، اور خوفناک چور ہو مجھے یقین ہے کہ خدا بغیر میرا سخت انتقام لئے ہوئے تمہین کبھی نہین چھوڑ سکتا۔

مین نے یہ خط اس لئے نہین لکھا کہ تم اپنی حرکتون پر پچتاؤ، اور نہ اس لئے کہ تمہارا دل پسیجے۔ کیونکہ تمہاری ذات اس سے نہ صرف محروم بلکہ بے نیاز ہے، اور خصوصاً اس وقت مجھے تم سے کیا امید ہو سکتی ہے جب مین قبر کے کنارے آ لگی ہون، اور زندگی کو پوری طرح خیرباد کہہ رہی ہون۔ اس لئے حاشا وکلا مجھے تم سے کوئی امید نہین ہے، صرف ایک تمہاری امانت ہے جو مین تمہین دیدینا چاہتی ہون، اور وہ تمہاری بیٹی ہے .... اگر تمہارے دل مین ذرہ برابر بھی بنی نوع انسان سے محبت کرنیکا جذبہ موجود ہے تو اس خانمان بربادی کے باپ بنو اور خدارا اُسے موت کے پنجے سے نکال لو۔ ورنہ وہ بھی اسی طرح مرنے پر مجبور ہو جائیگی۔"

مین نے ابھی خط ختم نہین کیا تھا کہ میرے دوست کی گریہ وزاری اور سرد آہون نے بے اختیار

ستو پھر ا گیا۔ میں نے پوچھا پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ اس نے کہا میں نے اس خط کو پڑھکر محسوس کیا کہ میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ دل ہے کہ بلیوں اچھل رہا ہے کچھ دیر تو فرط غم سے تصویر مجسم بنا رہا آخرش اس کے گھر جانے پر مجبور ہو گیا۔ اور وہ یہی کوٹھری ہے جس میں تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ غالباً اسی چارپائی پر جس پر اب میں لیٹا ہوا ہوں ایک بے جان لاشے کو پڑے دیکھا۔ اس کے پاس ہی اسکی معصوم بچی بیکسانہ انداز سے رو رہی تھی۔ میں یہ المناک منظر دیکھ کر حیران ہو گیا۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ عجیب عبرت آموز واقعہ تھا۔ میرے گناہ ایک ایک کر کے میرے حافظہ میں مجتمع ہونا شروع ہو گئے۔ قوت متخیلہ نے انہیں میرے سامنے عجیب خوفناک اشکال میں لا کھڑا کیا۔ میں تھرا گیا اور کانپتی ہوئی آواز میں عہد کیا کہ تا دم زلیست اس کوٹھری کو نہیں چھوڑونگا اور اسی طرح گھل گھل کر مروں گا جس طرح اس بیگناہ کا خاتمہ ہوا۔ یہی در و دیوار مجھے سسکیاں بھرتے ہوئے، دم توڑتے ہوئے دیکھیں گے۔ اور نفرت و ملامت کی جگر پاش صداؤں سے مجھے الوداع کہینگے۔

دیکھئے آج میں مر رہا ہوں لیکن میرا دل خوش ہے اور مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ خدائے تواب نے میرے تمام گناہوں کو بخش دیا ہے کیونکہ میں اپنے عہد پر قایم ہوں اور آج اُسے پورا ہوتے دیکھ رہا ہوں۔

وہ یہیں تک پہونچا تھا کہ گویائی نے جواب دے دیا۔ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ دھم سے فرش پر گرا اور گر کر جان دے دی۔ میں دیر تک بیٹھ کر روتا رہا اور لاوارث بچی کو تسلی دیتا رہا جس کا اب خدا کے سوا کوئی والی وارث نہ تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اس کے اعزا و اقارب کو تار دئے جنازہ میں لوگوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ آہ و بکا سے فضا میں غیر معمولی شور برپا ہو گیا۔"

خدا جانتا ہے میں قصہ ختم کر رہا ہوں لیکن میرا دل میرے قابو میں نہیں۔ مجھے رہ رہ کر اس کا یہ آخری جملہ بے چین کر رہا ہے۔ "میرے دوست .... میری بچی ....!!!

مدوجزر

ایک دوشیزہ کی زبان سے

(از فخرالدین فخر۔ ایچولوی)

اُف رے تری دوشیزگی عالمِ نوبہار کی
محوِ خرامِ ناز ہے ایک پری خمار کی
تیری ادائے خامشی، ایک فریبِ ساحری
تیری نگاہِ دلبری ایک طلسمِ سامری
رقص کناں ہے بیخودی شوخ ترے شباب مین
جذبۂ دل ہے بیقرار آئینۂ حجاب مین
تیرا جمالِ بیہوشی کھینچ لے روحِ حیات
تیرے کشش کے تار پر گھوم رہی ہی کائنات

کون ہے کیا ہے، تو بھلا کیا ہے فسانۂ شباب
مجکو دوشیزہ کچھ سنا اپنا ترانۂ شباب
چہرہ پہ آب و تاب کیون دلمین یہ پیچ و تاب کیون
پیکرِ حسن مین ترے رنگِ رخِ گلاب کیون
کیا یہ ہی شانِ دلبری ہے تیری منزلِ مراد
باغِ جہان مین ہر گھڑی یونہی رہیگی شاد شاد
یا کوئی اور مشغلہ تیرا شریکِ کار ہے
عالمِ عیش مین تجھے بھی غمِ روزگار ہے

بولی دوشیزہ کیا کہون بات جو آشکار ہے
حسن و شباب کچھ نہین نشہ ہے یا خمار ہے
باغ مین آج پھول سے کہہ رہی تھی کوئی کلی
تجھپہ جو کچھ گذر گئی مجھپہ بھی کل کو آئیگی
نکہتِ گل شگفتگی حالتِ خستہ جائیگی
باغِ جہان سے ہر کلی یونہی شکستہ جائیگی

فخر شباب رنگ و بو ابھرا ہوا حباب ہے
ناز و ادا و بانکپن ایک طلسمِ خواب ہے



حُبِّ وَطن

ایک مصری ادیب کے قلم سے

(مترجم محمد یوسف انصاری (فاضل) اعظم گڈھی)

جوئی خون می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

وطن کی محبت نے میرے دل و دماغ مین اپنا گھر بنا لیا ہے۔ اسکی جادو بھری محبت میرے قلب مین اقامت گزین ہے۔ محبت کی غیر معمولی تاثیر۔ غیر مکیف اثر۔ دل مین موجود ہے۔ جو لفظون مین بیان نہین کیا جاسکتا۔ مین چاہتا ہون کہ صفحۂ قرطاس پر اپنے دلی جذبات۔ قلبی کیفیات، کا نقشہ کھینچ دون۔ لیکن حیران ہون کس طرح کھینچون؟ اپنا درد دل آپ کو دکھانا چاہتا ہون لیکن حیرت ہے کس طرح دکھاؤن افسوس! میرے پاس وہ الفاظ نہین جو میری حقیقی ترجمانی کرسکین۔ اور مین تحریری تصویر آپ کے سامنے پیش کردون اگر منطقی نقطۂ نظر سے علیحدہ ہو کر دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غیر ممکن نہین، لیکن دشواری سے کون انکار کرسکتا ہے۔ پھر دلی جذبات کو پیش کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ ؎

اس گلستان مین مگر دیکھنے والے ہی نہین
داغ جو سینے مین رکھتے ہین والے ہی نہین

بہرحال مین ہدیۂ ناظرین کرتا ہون۔ اور چاہتا ہون کہ وہ بھی اس درد مین مبتلا ہون۔ ان کے سینے مین بھی درد، اور درد مین تڑپ پیدا ہو۔

وطن کے ساتھ مجھے محبت نہین بلکہ عشق ہے۔ میری شیفتگی اور وارفتگی، تمام جذبات محبت سے بھری ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹھنڈی ہوا چمن کی دلفریب فضا۔ تارون بھری رات نسیم بہار کے جھونکے غنچون کی چٹک۔ پھولون کی مہک۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار۔ دلکش مرغزار۔ بھلے نہین؟

ہوتے؟ لیکن میرے دل مین اسکی کچھ وقعت نہین۔ میرے دل و دماغ مین اگر کوئی خیال ہے تو وطن کا۔ آنکھون مین اگر کوئی صورت بسی ہوئی ہے تو وطن کی۔ میرے سامنے اگر کسی کا نقش ہے تو وطن کا۔ اسی کی محبت مین سرشار اور اسی کی بادۂ الفت سے مست اور مخمور ہون۔

مادر وطن! جس طرح تو میرے ماں باپ کا مولد و مسکن ہے اسی طرح میرا بھی ہے۔ جس طرح ان کی تربیت، پرداخت، تجھسے ہوئی ہے اسی طرح مری۔ ہم چھوٹے تھے، تجھ پر بسے۔ تیری پیداوار سے ہماری نشو و نما ہوئی۔ تیری ہی محبت بھری گودون مین ہم پلے۔ بڑے ہوئے۔ اور چلنے پھرنے لگے۔ ماں باپ نے بھی اپنے فرائض کو تجھ ہی سے پورا کیا۔ سفر و حضر، اقامت، و رحلت مین تیری طرف نسبت ہمارے لئے باعثِ صد عزت و صد افتخار رہی۔

اگر ماں رحم کرتی ہے، مہربانی سے پیش آتی ہے، تو یہ کیا ہے؟ یہ وہی محبت ہے جو تری محبت سے مکتسب ہے۔ اس نے ہم کو خونِ جگر پلایا۔ اپنے دودھ سے ہم کو سیراب کیا، اور سینچا، یہ دودھ کیا تھا؟ تیرے جود و کرم کی ایک نہر، یا تیرے عطا و بخشش کی ایک سلسبیل، جس سے وہ اس سے پہلے سیراب ہو چکی ہے۔ اس نے ہماری پرورش کی کیون؟ اس لئے کہ ہم بڑے ہون اور اغیار و اجانب کے ظلم و ستم سے تجھے مصئون اور محفوظ رکھین۔ اگر ماں کے دل مین تیری محبت نہ ہوتی تو کبھی اس کے شجرِ لطف و عنایت مین نشو و نما نہ ہوتی۔ تیری ہی محبت سے اصل محبت مین کونپلین نکلین۔ شاخ اور ٹہنیاں پیدا ہوئین۔ برگ و ثمر آئے۔ اور بارآور ہوئی۔ تو ہی ان جذبات محبت کا منبع اور حقیقی سرچشمہ ہے۔

ماں کی شفقت بھری گودون مین ہم سوئے۔ ہماری حفاظت کے لئے آنکھ پر آنکھ نہ لگائی پلکین جھپکنے نہ پائین۔ تمام رات بیداری اور اختر شماری مین گذار دی، تاکہ ہمین معلوم ہو جائے کہ وطن کی حفاظت و صیانت آزادی اور حریت مین اس قدر اور اس طرح مصائب و تکالیف برداشت کرنے پڑینگے۔ اغیار سے تجھے محفوظ رکھنے مین اس طرح شب بیداری اور نگرانی و حفاظت کرنی ہوگی۔

دیس ماتا! مجھے اگر بھائی سے محبت ہے تو اس لئے اور صرف اس لئے کہ وہ مرا برابر کا شریک ہے۔ جب تیری طرف غیرون کا دستِ ظلم بڑھتا ہے تو وہ مرا مونس۔ و غمخوار ہوتا ہے۔ وہ مرا دست و

بازو بنجاتا ہے۔ جس سے تجھپر آنیوالی مصیبتون کو دور کرتا ہون۔ جب مین تری خدمت کے لیئے دشوار گذار گہاٹیان فلک نما پہاڑیان، تکلیف دہ اور خطرناک راستے طے کرتا ہون تو وہ مرا رفیق اور ساتھی ہوتا ہے۔ میرا بہائی میری شمشیر آبدار ہے۔ دہرِ ستم شعار، فلکِ ناہنجار جب تیرے ساتھ عداوت اور دشمنی پر آمادہ ہوتا ہے، تو اُسے میان سے کہینچ لیتا ہون۔ میرا شریک زندگی بہائی میرے لیئے دام و جال کا کام دیتا ہے۔ جس سے مین سعادت خوش بختی، تیری شادابی اور زرخیزی کی چڑیون کو جو تیری الفت و ترقی کے فضا مین چہچہاتی ہین شکار کر لیتا ہون مین اور میرا بہائی تیرے قصر عالی کے ستون ہین۔ باہمی محبت ہے اور ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد پر قایم ہے۔ وہ بنیاد کیا ہے؟ تری طبعی، دائمی، غیر منفک محبت ہے۔

پیارے وطن! تو ہی مرا خوشگوار مسکن ہے۔ وطن سے دور ہوکر انسان خواہ فرشِ حریر پر چلے ہر قسم کے آرام، و آسایش کے اسباب بہم ہون، لیکن یہ سب اس کی نظرون مین خار معلوم ہوتے ہین اور سچ تو یہ ہے ؎

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لون نہ ہرگز اگر بہشت ملے

مین تو تیرے ہی آسمان سے سایہ کا طلبگار ہون۔ مجھے ہر چیز اسوقت بہلی معلوم ہوتی ہے۔ مین خوش کن چیزون سے اسی وقت لطف اندوز ہوتا ہون، جبکہ تو سر سبز و شاداب ہو۔ انسان وطن سے دور ہوتا ہے۔ سفر مین دوسرے مسافرون کے ساتھ مواخات اور دوستی قایم کر لیتا ہے۔ لیکن جب کبھی اس کا کوئی ہم وطن اسے ملجاتا ہے۔ تو گلے سے لپٹ جاتا ہے۔ دو حقیقی بہائیون سے زیادہ محبت ہوجاتی ہے یہ محبت کیون ہے؟ صرف اس لیئے کہ وہ تیری سرسبز زمین مین پیدا ہوئے۔ اور تیری ہی عزت و رفعت کے سینے سے انہون نے دودہ پیا اور پرورش پائی۔

ایک فقیر کو تونگری سے، جان بلب مریض کو آبحیات سے، مایوس اور نا اُمید کو کامیابی سے۔ قحط اور خشک سالی کے بعد ارزانی اور شادابی سے کس قدر فرحت اور کس قدر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہ لفظون مین بیان کی جاسکتی ہے؟ لیکن تیری شادابی، تیری حریت سے مجھے اس سے کہین زیادہ

خوشی حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کے آخری گھنٹوں تک، جب تک جسم مین جان ہے۔ منہ مین زبان اور زبان مین طاقت گویائی ہے تجھے یاد کرتا رہون گا۔ میرے وطن! میری ہر پکار مین تیری یاد ہے۔ تیرا ذکر میرے لئے تسکین روح' اور دل آرام ہے۔ تیرا بار بار ذکر تیرے نام کی تکرار، میرے لئے سرمایۂ حیات اور باعث زندگی ہے۔

اپنی جان کی قسم' میرے پاس سب سے بیش بہا اور انمول چیز میری جان ہے۔ مین اسے تجھپر قربان کرتا ہون۔ تیری ترقی' و رفعت کی دیوی پر اپنی جان کی بھینٹ چڑھاتا ہون۔ اپنی ملکیت کا اعلیٰ جوہر تیرے سامنے پیش کرتا ہون۔ کیا میری قربانی تجھے منظور اور پسند ہے؟

مین آلام و مصائب جھیلون گا۔ تاکہ تو آزاد رہے۔ درد، دکھ سہون گا۔ تاکہ تو خوشگوار' سرسبز اور شاداب رہے۔ مین اپنی زندگی کو تجھپر نچھاور کرون گا۔ تاکہ تو زندہ رہے۔ لیکن کیا ہماری محبت کی یہی حد ہے نہین، یہ تو کچھ بھی نہین۔ تیری محبت، تیرے جذبات الفت کی بجلی کی یہ ایک چمک، تیرے درد کی یہ ایک تڑپ ہے۔

تیری عزت و رفعت، کے چشمون سے سیراب ہونیوالے تیرے فرزند ہمیشہ تجھپر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہین۔ تیری پکار پر لبیک کہین۔ تیری آواز پر سر تسلیم خم کردین' تیرے حکم پر اپنی جان کو تیرے نذر کردین۔ یہی وہ رہگذر ہے جسپر ہمارے پیشرو چلے۔ ہم اسی منزل سے گذر رہے ہین تاکہ آنیوالی نسلین ہمارے نقشِ قدم پر چلین۔

فرزندان وطن! تمہارا وطن بیکسی اور بےبسی کے عالم مین چیختا ہے، تمہارا وطن جان بلب ہے نزع کا عالم ہے۔ اسے عیسیٰ نفس' آبحیات کی ضرورت نہین۔ بلکہ تمہارے خون دل و جگر، تمہاری جان کی ضرورت ہے۔ کیا اس کے لئے تم تیار ہو؟ تمہارا وطن تم سے اسی چیز کا مطالبہ کر رہا ہے۔ سنو! کیا کہہ رہا ہے؟

"میرے لاڈلے بچو! آنکھین کھولو کب تک سوؤ گے۔ دن نکل چکا۔ اپنے نرم بستر سے اُٹھو خواب استراحت چھوڑو زادِ راہ لو' اور چل نکلو آرام و خوابگاہون کو خیرباد کہو۔ آرام و راحت عیش و عشرت کا خیال دل سے دور کرو۔ میرا تم پر حق ہے۔ مین تمہاری جان چاہتا ہون، کیا تم اسے دینے مین عذر نہ کرو گے؟ کیا تم اب بھی سوتے رہو گے۔ دیکھو دیکھو۔ زمانہ تمہین کیا درس دے رہا ہے؟"

محشرِ جذبات

(از سرشار کسمنڈوی- مدیر حسن خیال مہوبہ)

پھر دیکھ اُسی ادا سے اشارہ کہین جسے
ڈھا دے پھر اُسکو قصرِ تمنا کہین جسے

صحرا نوردِ عشرتِ صحرا کہین جسے
اِک چیز ہے وہ آبلۂ پا کہین جسے

اک جست کا ہے دامنِ صحرا کہین جسے
جولانگہِ خیال کا ٹکڑا کہین جسے

حسرت نہ کر سحر کی مریضِ شبِ فراق
پیکِ اجل ہے صبح کا تارا کہین جسے

لے آئی کھینچ کر مجھے کوئے حبیب مین
وہ بیخودی کہ جوشِ تمنا کہین جسے

کس درجہ جانگداز ہے کس درجہ جانگسل
اے ہم نشین کشاکشِ دنیا کہین جسے

دنیا سے لیچلا ہون مین اے مرگِ ناگہان
وہ اضطراب جوشِ تمنا کہین جسے

لایا ہون اپنے ساتھ لحد مین وہ بیخودی
اک یادگارِ غفلتِ دنیا کہین جسے

کس درجہ جانگداز ہے مجنون کی سرگذشت
تفسیرِ کج نگاہیِ لیلا کہین جسے

ہے دل کی کائنات کا ایک عنصرِ لطیف
اہلِ نگاہ خونِ تمنا کہین جسے

اس دل سے واسطہ تجھے اے موجِ انبساط
اُجڑی ہوئی امید کی دنیا کہین جسے

آخر نگاہِ داورِ محشر نے پالیا
وہ زخمِ دل نشانِ تمنا کہین جسے

دیکھی گئی نہ اُس سے مری آخری نظر
تصویرِ کسمپرسیِ دنیا کہین جسے

تیرا ہی ہو فا وہ غمِ جان گداز ہے
سب میرے دل کے خون کا پیا کہین جسے

سرشار ایک وہ کہ ہین جانِ حیاتِ عیش
اک مین کہ ننگِ ہستیِ رسوا کہین جسے

تعلیمِ نسوان

(مولانا محمد جعفر حسین صاحب بدایونی)

عنوانِ بالا کی موافقت اور مخالفت مین ہزارہا مضامین مختلف رسائل و اخبارات مین شایع ہوچکے ہین۔ اور یہ مبحث اب اس درجہ فرسودہ ہوگیا ہے کہ اس موضوع پر مزید لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔ مسئلہ زیربحث کے متعلق جتنے مضامین اب تک میری نظر سے گذرے ہین باستثنائی چند تمام کے تمام انتقام سے مملو نظر آتے ہین۔ جن مین بجائے دلائل و براہین کے زورِ قلم سے کام لینے کی ناکام کوششین کی گئی ہین۔ افسوس ہے کہ مسلمانون کا ایک متفق علیہ مسئلہ آج طبع آزمائی کا ذریعہ بنگیا ہے۔ اس ترقی و تمدن کے زمانے مین حدیث **طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ** کی موجودگی مین نفس تعلیم سے کسی مسلمان کو انکار کی جرأت نہین ہوسکتی۔

صرف طریق تعلیم و نصابِ تعلیم مین اختلافات ہین۔ ایک فریق کا دعویٰ ہے کہ جب تک عورتون کو اعلیٰ تعلیم نہ دی جائیگی مسلمانون کی سوشیل اور اقتصادی حالت درست ہونا ناممکن ہے۔ فریق مخالف کا بیان ہے کہ اگر عورتون کو اعلیٰ تعلیم دی گئی تو مسلمانون کی مذہبی اور سوشیل حالت بدسے بدتر ہو جائیگی۔ ہردو فریق کے دلائل پر نظر غایر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم کا جھگڑا ہے۔ مسلمان عورتون کے تعلیمی اعداد و شمار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ فی ہزار صرف چند عورتین معمولی نوشت و خواند سے واقف ہین۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم خواتین تو سارے ہندوستان مین چند ہونگی تعلیم سے لاپرواہی کیوجہ سے آج ہماری ہزارون بہنین ارکان دین اور معمولی مسائل دینی سے بھی ناواقف ہین۔ ایک ذرا سا خط پڑھوانے کے لئے کتنے گھرون کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ بلا ابتدائی تعلیم حاصل کئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ممکن ہی نہین۔ اس لئے حامیان اعلیٰ تعلیم اپنے دعاوی سے تھوڑے زمانہ کے لئے باز آجائین اور متفقہ طور پر ایک ایسا پروگرام قوم کے سامنے پیش کرین جس سے ابتدائی تعلیم ہی عام ہوجائے۔ جب ابتدائی تعلیم عام ہوجائیگی اسوقت اعلیٰ تعلیم کے

حسن و قبح پر بحث کر لی جائیگی۔

تمام ملک پر اس سرے سے اس سرے تک ایک نظر ڈالئے اور بغور دیکھئے تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی زمین میلون تک ایسے اسلامیون سے بسی ہوئی ہے جن کی وقعت جنگلی جانورون سے زیادہ نہین۔ عورتون کا ذکر نہین مردون کی حالت قابل رحم ہے۔ پھر ایک دوسری آبادی ایک ایسے لوگون کی ملیگی جن مین مرد تو کسی قدر تعلیم یافتہ اور متمدن ہین لیکن عورتین قطعی جاہل اور غیر مہذب ہین۔ ایسی مخلوق زیادہ تر دیہاتون مین آباد ہے۔ ان سے بھی گذرئے تو ایک گروہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانون کا ملیگا۔ ان کی عورتین یا تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہین یا کم از کم ابتدائی نوشت و خواند سے واقف ہین ان سے ہمین بحث نہین۔ البتہ پہلے طبقہ کے جنگلی انسان اس امر کے محتاج ہین کہ ان مین ذکور و اناث دونون جنسون کی تعلیم کے لئے یکسان تعلیم کا پروپگنڈا کیا جائے۔ دوسرے طبقہ کے مسلمانون کے لئے جو عموماً دیہات کے باشندے ہین۔ یہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مین گاؤن گاؤن زنانہ و مردانہ مدارس قایم کر دئے جائین تا کہ انہین تعلیم سے لگاوٹ و دلچسپی پیدا ہو۔ علاوہ ازین مدارس شبینہ بھی کھولے جائین جن کے لئے گاؤن کی مسجدین نہایت موزون ہین۔ ان مدارس شبینہ مین بڈھے اور سن کار و باری مسلمان تعلیم پائین۔

نصاب کے لئے یہہ ضروری نہین کہ وہ کسی خاص کمیٹی یا شخص کی بنائی ہوئی کتابین پڑھین بلکہ وہ جس سلسلہ کی کتابین چاہین شروع کر دین۔ مدعا صرف یہ ہے کہ وہ کتب اور اخبار بینی کے قابل ہو جائین پھر یہی لوگ بتدریج اپنی عورتون اور لڑکیون کو پڑھانے کی ضرورت محسوس کرنے لگین گے۔ اور بہترین صورت جو موقع اور مقام کے لحاظ سے ان کے پیش نظر ہو گی اختیار کر لین گے۔

بہر حال ضرورت یہ نہین ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لئے صرف نصاب کی تلاش مین مدتین گذار دی جائین بلکہ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے تمام کے تمام تعلیم کی طرف متوجہ اور مائل ہو جائین اس موقع پر تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ہر آن خلوت و جلوت مین تعلیمی پروپگنڈا کیا کرین۔

اناطولیہ

(مولانا مسعود الرحمن خان - ندوی)

اناطولیہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی مشرق کے ہین - اور جغرافیہ مین اس کا اطلاق ایشائی کوچک اورسلطنت عثمانیہ کے بعض دوسرے مقبوضات پر ہوتا ہے - رومیون کے زمانہ مین اناطولیہ کو "ایشیائے کوچک" کہتے تھے - اناطولیہ کے حدود اربعہ یہ ہین -

شمال مغرب مین درہ دانیال، بحر مرمرا، باسفورس، اور بحر اسود - مشرق مین سلسلۂ کوہ ارمینیا جنوب مین بحر متوسط اور مغرب مین بحر ایجہ اور مجمع جزائر یونان -

اس کا رقبہ تقریباً ۲ لاکھ ۱۲ ہزار مربع میل ہے طول زیادہ سے زیادہ سات سو میل ہے - اور عرض چار سو میل - اناطولیہ کے سواحل سطح بحر سے بلند اور نہایت سنگین چٹانون سے بنے ہوئے ہین مغربی سواحل دنیا کے سب سے زیادہ دندانہ دار سواحل مین سے ہین - اور بالکل پہاڑی ہین اندرون ملک مین بھی پہاڑون کے بہت سے سلسلے پھیلے ہوئے ہین جن مین سب سے بڑا اور مشہور سلسلہ کوہ طورس کا ہے جو ساحل بحر سے شروع ہوکر دریائے فرات تک چلا جاتا ہے -

ملک مین بہت سے بحیرے بھی ہین - جن کا پانی نہایت ہی شور ہے - سب سے بڑا بحیرہ قونیہ سے ستر میل شمال مشرق مین واقع ہے - اس کی درازی ۵۵ میل ہے اور چوڑائی ۱۰ سے ۵ میل تک اس سے ملک کی ضروریات کے لئے بہت بڑی مقدار مین نمک نکالا جاتا ہے - دریاؤن مین دو دریا بہت مشہور ہین - "قزل ارسق" اور "سکاریہ" - پہلا دریا سیوان سے ۴۰ میل ادھر سے نکلتا ہے اور بحر اسود مین گرتا ہے - دوسرا انقرہ کے قریب سے نکل کر بحر اسود سے مل جاتا ہے - ملک کی آب و ہوا ازمنۂ قدیم سے مشہور ہے - مورخ - شعراء اور علماء جغرافیہ ہمیشہ سے اسکی تعریف مین رطب اللسان رہے ہین - آب و ہوا غایت درجہ صحت بخش وعمدہ ہے - پہاڑ گرمی کی شدت کو کم کر دیتے ہین اور سمندر جاڑے کی ٹھنڈک کو معتدل بناتے ہین -

اناطولیہ کے بعض مقامات مین معدنی چشمہ بکثرت پائے جاتے ہین۔ جن سے نہایت گرم و کبریتی پانی ابلا کرتا ہے۔ اور اُن چشمون کے گرد مخروطی شکل مین جم کر ٹھہر جاتا ہے۔ بعض مقامات مین زمین سے مشتعل ہوجانے والی گیس نکلتی ہے، اور ایک جگہ ایک غار مین سے اس قسم کے بخارات نکلتے ہین جو چشم زدن مین انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہین، معدنیات بھی بکثرت پائی جاتی ہین۔ سیسہ، لوہا، تانبہ چاندی، اور سونے کی وافر مقدار پہاڑون مین موجود ہے۔ اور قدیم زمانہ مین ایک معتد بہ مقدار ان اشیاء کی برآمد بھی کیجا چکی ہے۔ سارا ملک نہایت زرخیز اور اپنی حاصلات اور پیداوار کے اعتبار سے دنیا بھر مین مشہور ہے۔ طرح طرح کے میوے۔ پھل۔ غلہ۔ اور تمباکو کے علاوہ انواع واقسام کی قابل استعمال لکڑی اس کے پہاڑی جنگلات مین بکثرت پیدا ہوتی اور تمام ممالک عثمانیہ کی ضروریات پوری کرتی ہے۔

اس کے ماسوا ہر قسم کے چوپایون کی افزائش بھی بہت ہوتی ہے۔ اناطولیہ کی بھیڑ۔ بکری اور گھوڑا تمام دنیا مین شہرت رکھتا ہے۔ بھیڑ بکری کی شہرت نرم بالون کی وجہ سے ہے اور گھوڑا اپنی تیز رفتاری اور مضبوطی کے طور سے ازمنۂ قدیم سے ضرب المثل ہے۔ ملک مین زراعت کے علاوہ تجارت وصنعت وحرفت بھی اچھی ہے، جن مین زیادہ قابل ذکر انجیر۔ بھیڑ و بکری۔ اور اونٹ کی اون۔ دباغت کی ہوئی کھالین۔ کہربا۔ لاجورد، افیون۔ مشک۔ قالین۔ گیہون۔ روئی۔ تل۔ اور جو ہے۔ ریشم اور سوت کے متعدد کارخانے بھی ہین۔ اور قہوہ اور چاء کے باغات اپنی مثال مین فرد ہین۔ اناطولیہ دنیا کے اُن ملکون مین ہے جو غایت درجہ تاریخی اہمیت رکھتے ہین۔ وہ ہمیشہ مشرق ومغرب کے مابین پل کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ تقریباً ۴ ہزار سال سے مختلف وحشی قبائل و اقوام کا آماج گاہ بنا ہوا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً بے شمار قومون نے اُسے تاخت وتاراج کیا ہے۔ اس کا تمدن بھی بہت قدیم ہے۔ اور یونانی تمدن سے ... زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ یونان مین علم وحکمت کا چراغ یہین کے حکمار۔ شعراء اور فلاسفہ نے جلایا ہے۔ چنانچہ مشہور فلاسفر تھامس، بٹاگوس بیاس۔ کلیوپولو۔ اکیسمندریس۔ فیثاغورث۔ اور زینوفون۔ ہرکلیس اور ہومر جیسے شہرۂ آفاق

شاعر اسی کی مبارک خاک کے درخشان ذرے ہین۔ جن کی یاد سے آج بھی ادبی دنیا کے قلوب متحرک ہین۔ یہی ذرے تھے جنہون نے آجتک یونان کے نام کو چار چاند لگائے۔

اب ہم اس کی قدیم تاریخ سے ہٹ کر اس کے کچھ انقلابی دورون کا تذکرہ کرتے ہین کہ باوجود ان شدائد و مصائب کے آج بھی اس کی وہی حالت ہے جو اب سے پہلے ازمنۂ قدیمہ مین تھی۔

۱۱۲۰ق۔م مین یونانیون نے اناطولیہ مین قدم جمانا شروع کئے اور اسکے باشندون کو بتدریج مغلوب کرنے لگے۔ ۵۴۶ق۔م مین کورش شاہ ایران نے اس پر قبضہ کیا۔ پھر ایرانیون کے ساتھ اسکندر اعظم کے معرکے اس سرزمین نے دیکھے۔ اس کے بعد سپہ سالارون کی خانہ جنگی کا میدان بھی اسی کو گرم ہوا۔ ۲۷۲ق۔م مین تدسر کی عربی ملکہ زنوبیہ نے اس کے ایک بڑے حصے کو فتح کیا۔ لیکن کچھ روز کے بعد رومانیون نے اسکو پھر واپس لے لیا۔ اور جب ۳۲۳ء مین قسطنطین اعظم نے بزنطیہ (قسطنطنیہ) کو روما کے مقابلے مین مشرقی سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا تو اناطولیہ کی طرف اُسے خاص توجہ ہوئی۔ اور اوسنے اور اس کے جانشینون نے اس کی اصلاح و تعمیر مین پوری کوشش کی اور اسکو گلزار بنادیا۔

اسی رومی عہد مین اناطولیہ نے بہت ترقی کی خصوصاً اس وجہ سے کہ مسیحیت کا وہ ایک مرکز ہوگیا تھا۔ اور حواریون کی کارگذاریون کا ایک بڑا حصہ اس سے متعلق تھا۔ وہ سات مسیحی گرجون کا مرکز تھا۔ اور اوس مین متعدد مذہبی تاریخی اجتماع منعقد ہوئے۔ جو تاریخ عیسوی کا قابل یادگار سرمایہ ہین

(۲)

ساتوین صدی عیسوی سے اس پر مسلمانون کے حملے شروع ہوتے ہین۔ چنانچہ عربون نے مشرقی بلیشیا کا علاقہ فتح ہی کر لیا تھا۔ لیکن ۹۶۵ء مین رومیون نے اُسے پھر واپس لے لیا۔ ۱۰۶۰ء مین ترکون نے بلیشیا فتح کیا۔ اور گیارہوین صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ تقریباً پورے اناطولیہ پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ اور شہر قونیہ کو انہون نے اپنا پائے تخت بنا لیا۔ صلیبی جنگون کے دوران مین اناطولیہ ہی مین ہوکر مجاہد جاتے تھے۔ اور اسی بنا پر یہان انکو مسلمانون سے بہت سی خونریز لڑائیان لڑنا پڑین اور ۱۱۰۱ء مین ان کے پانچ لاکھ آدمی اس اناطولیہ کے میدانون مین ہلاک ہوئے۔ ۱۲۶۲ء مین تاتاریون

ادبستان

نے اسکو پائمال کیا۔ سنہ ۱۲۸۰ء مین عثمان بن طغرل نے سلجوقیون کی سلطنت پر قبضہ کرکے اناطولیہ کو بالکل عثمانی ملک بنا دیا۔ سلطان آدرخان ابن سلطان عثمان نے قونیہ کے بجائے بروصہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ اور ملک کو بہت ترقی دی۔ سنہ ۱۶۰۲ء مین تیمور لنگ نے حملہ کیا اور سلطان بایزید کو شکست دیکر اکثر علاقون پر قابض ہوگیا۔ مگر چند ہی روز مین سلطان محمد فاتح نے تمام علاقہ جات واپس لے لئے۔ اور قسطنطنیہ وطرابزون کو فتح کرکے اناطولیہ کو بالکل محفوظ کرلیا۔ اسوقت سے یہ ملک برابر عثمانیون کے قبضہ مین ہے۔ محمد علی پاشا مصری نے بھی اس پر اسی صدی مین یورش کی تھی۔ اور اس کے اکثر حصون کو فتح کرلیا تھا۔ مگر یہ واقعہ چندان اہمیت نہین رکھتا۔ کیونکہ اول تو یہ اندرونی خانہ جنگی تھی اور دوسرے یہ کہ تھوڑے ہی عرصہ مین محمد علی پاشا کو تمام ملک خالی کردینا پڑا۔

۳

لہذا صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سات سو برس سے اناطولیہ عثمانی ترکون کا قومی وطن ہے اسی مین ان کی ساری آبادی ہے۔ اور اسی پر ان کی سلطنت کی بقا ہے۔ لیکن یوروپ کی مسیحی طاقتین خصوصاً برطانیہ ترکون کو اس ملک مین بھی آزاد نہین دیکھنا چاہتی۔ اب تک یہ کہا جاتا تھا کہ یوروپ کی سرزمین پر ترکون کو رہنے کا حق نہین۔ چنانچہ ڈیڑھ صدی کے اندر انھین یوروپ سے جلاوطن کردیا گیا۔ لیکن آئے دن ترکون کو ان کے ایشیائی وطن سے بھی جلاوطن کرنے کی ترکیبیں ہوتی رہتی ہین وہ نہین چاہتی کہ ایشیا کی سرزمین پر بھی یہ قوم آزاد رہ سکے۔

اقتباسات

(انگریزی جراید و رسایل سے)

رفتار زمانہ

(مولانا عبد الستار صاحب فاروقی)

رومیون کا وجود برطانیہ مین۔

پروفیسر آر۔ جی۔ کالنگ اوڈ جو "برطانیہ پر رومی قبضہ" کے زبردست زندہ موٗرخین مین سے ہین ابھی ایک درمیانی رپورٹ جو ماہ ستمبر ناٹ اینڈ فلیٹ اوڈ مین ملے ہوئے رومی سکون پر مشتمل ہے لکھتے ہین کہ ان سکون کا اکتشاف اسقدر اہمیت رکھتا ہے کہ جس سے رومن برطانیہ کی تاریخ پر نظر ثانی کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ ان سکون مین بہت سے ایسے ہین جو روم ہی مین مضروب ہوئے ہین۔ وہ نہ صرف نادرات زمانہ مین سے ہین بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت بہی بہت زیادہ ہے دو سکون پر والیرنس Valerians اور سلونیئس Saluninus بادشاہون کے نام کندہ ہین۔ یہ رومی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے ہین۔ اس لئے سکون کے نظریہ کی روسے شمالی مغربی انگلستان پر رومی قبضہ کی مستند تاریخ متعین کی جاسکتی ہے۔ اور اس ایک امر سے اس مضمون کی تمام پچھلی تاریخون کا منقلب ہوجانا بعید از قیاس نہ ہوگا۔

موجودہ ذہنیت پروفیسر رابرٹ اے ملیکان کا جو مشہور عالم سائنس دان اور علم طبعیات مین نوبل انعام حاصل کرچکے ہین۔ دعویٰ ہے کہ آج سے تین ہزار سال پہلے یعنی ایتھینیہ اور اسکندری عہد کی عقل سے موجودہ انسان کی دماغی حالت ہرگز زیادہ نہین ہے۔ وہ فرماتے ہین کہ یہ سچ ہے کہ عالم طبعی کے اختراعات جدیدہ سے عالم سائنس مین ایک انقلاب برپا ہوگیا ہے لیکن جہان تک

ہم عہد کہن کی تہذیب و تمدن کا موجودہ تمدن سے مقابلہ کرتے ہین۔ ہم ان مین یکسانیت پاتے ہین۔ ہم دیکھتے ہین کہ جس طرح آج لوگ اٹھتے بیٹھتے اور بات چیت کرتے ہین یہی حال آج سے دو تین ہزار سال پیچھے بھی نظر آتی ہے۔

ان چیزون سے جیسے عورت کا حسن آدمی کی قوت، فواکہات کی لذت۔ پھولون کی خوشبو دوستون کی دوستی۔ عدالت۔ طلاق و زوجیت اور گھوڑونکی ریس و مکابازی کے آج بھی وہی اثرات لوگون کی زندگیون پر مترتب ہوتے ہین جو پہلے ہوا کرتے تھے۔

زندگی کے مقاصد عالیہ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو ہم نے کوئی ترقی نہ کی ہے اور نہ کر رہے ہین۔ بارہا یہ سوال اُٹھایا گیا اور ہمیشہ دنیا کے نیک نام ادیبون فلاسفرون اور مذہبی پیشواؤن کی طرف سے اس کا جواب نفی مین ملا ہے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے کی فنون لطیفہ سے متعلق طوتاخامن کے مقبرہ مین چیزین ملی ہین جو بزبان حال اس شعبہ کی موجودہ چیزون سے اپنی ہمسری کا دعویٰ کر رہی ہین۔

اگر ہم بسہولت تمام تحیر خیز یونانی مجسمون اور یونانی تعمیری آثار کی نقل اتارین تو پتہ چل جائیگا کہ آج ہماری دماغی حالت ایتھنی اور اسکندری عہد کے مقابلہ مین کہانتک ترقی یافتہ ہے۔

مغربی خاتون صحرائے عرب مین کاؤنٹس ملگنسٹی وہ پہلی یوروپین خاتون ہے جس نے عرب کے ان صحراؤن سے سفر کیا ہے جن سے مغربی سیاح بھی بہت کم واقف ہین۔ اس خاتون نے اپنے اس سفر کی کہانی وائڈ ورلڈ میگزین مین قلمبند کی ہے۔ عرب سلاطین سے اجازت لیکر اس نے دمشق سے ایک بڈھے اونٹ والے کی رہنمائی مین اپنے سفر کا آغاز کیا اور راستہ کی صعوبتون اور تکلیفون کو سہتی ہوئی مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئی اور یہان سے پھر دمشق کو واپس ہو گئی۔ اس دوران مین وہ عربی لباس استعمال کرتی رہی۔ اس نے دوران سفر کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جسے یہان نقل کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا "شام کے کھانے کے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک عرب نے میرے لئے کھانا لاکر تیل سے

رکھا اور یکایک بے تحاشا کود کر دوسری طرف جا رہا۔ مین نے پوچھا کیا ہوا؟ تو اس نے جواب دینے کی بجائے رونا اور ساتھ ہی ساتھ ہنسنا بھی شروع کر دیا اور اچھلتا کودتا ہوا گانے گانے اور چلانے لگا۔ مین سمجھی یہ پاگل ہوگیا ہے۔ اس لئے شیخ کو آواز دی "خدا کے لئے" اُس نے آتے ہی کہا۔ جلد باجہ بجاؤ اس کو ترنتولا Tarantula نے کاٹا ہے، یہ سنا پانتے ہی نوکرون نے ٹین پیٹنا شروع کر دیا۔ بیچارہ مجروح اچھلتا کودتا رہا اور شور کرتا رہا قریباً ۲۰ منٹ تک یہ شور وغل ہوتا رہا۔ پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ "اب اسکی جان بچی" شیخ نے کہا۔ وہ بھی آدمیون کا خیال ہے کہ راگ راگنی سے ترنتولا کاٹے کی جان بچتی ہے۔ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ایسے مجروح کو بہت زور شور سے ناچنا چاہئے۔ جب وہ آدمی ٹھیک ہو چکا تو ترنتولا کی تلاش ہونے لگی۔ کیونکہ یہ ڈر تھا کہ کہین وہ اور کسی کو مجذوب یا مجروح نہ کر دے۔ وہ مرے چھوٹے ٹیبل کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بنفشی رنگ کا بڑے مکڑے کی صورت کا تھا۔ مین نے چاہا کہ اسکو مار کر رکھ لون مگر انہون نے کہا کہ یہ مرا ہوا بھی ضرر پہونچاتا ہے۔ اس لئے اسکو پامال کر کے خاک مین ملا دینا بہتر ہے۔

عورتین کیا کر رہی ہین۔ "استری دھرم" ہندی جریدہ نے دنیا کی عورتون سے متعلق حسب ذیل معلومات شایع کی ہین۔ چین کی دو مشہور ڈاکٹر لیڈیاں۔ ڈاکٹر نگ چی موٹی ڈکنیٹن اعلیٰ پیمانے پر عورتون اور بچون کے ایک ہسپتال کی دیکھ بھال کرتی ہین وہ خود اس کی مالکہ ہین۔ ڈاکٹر مری اسٹون نے بھی اسی قسم کا ایک ہسپتال ننگھائی کے وسط مین کھولا ہے۔ ان دو کے علاوہ پیکن کی یاماکن لیڈی ڈاکٹر بھی اپنے پیشہ مین مشہور ہین۔

جاپان کی کاروباری عورتین "ہوم آفس سوشیل بیرو" کی اطلاع کے موافق جاپان مین گیارہ لاکھ عورتین کاروبار کرتی ہین۔ ان مین سے ۵۰ فیصدی صرف ٹوکیو مین رہتی ہین لیڈی ڈاکٹر نرس اور اسی شعبہ کی دوسری عورتون کی تعداد ۹۰۰۰ ہزار ہے استانیان ۸۰۰۰ ہزار ہین۔ سرکاری دفاتر مین ۴۵۰۰ ہین۔ تجارت پیشہ عورتون کی تعداد چھ لاکھ ۷ ہزار ہے۔

فلسطینی عورتوں کی ترقی۔ فلسطین میں ایک یہودی انجمن مساوی حقوق نسوان ہے جسکی شاخیں سات بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ اسکی ایک ہزار عورتیں ممبر ہیں۔ ایک لاکھ عورتوں میں سے اٹھائیس کو فلسطین کی نیشنل اسمبلی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ اسمبلی کی مجلس منتظمہ کی ۳۲ مردوں میں چار عورتیں بھی ممبر بنائی گئی تھیں۔

اضطرار شاد

(محمد ارشاد حسین شاد صابری)

شوق میں ہیں دیدۂ و دل بیقرار — ہو گئی محفل کی محفل بیقرار
انقلاب دہر دکھلا کر ہمیں — کر دیا عالم میں اے دل بیقرار
اور کیا ہو انقلاب شوق میں — ہیں نگاہیں مضطرب دل بیقرار
فرصت نظارۂ عالم کہاں — اپنے جلووں میں ہے بسمل بیقرار
گردشوں میں ہیں زمین و آسمان — ہو رہی ہے ہر دو منزل بیقرار
رہ گئی تھک تھک کے سعی ناتمام — آئیں موجیں تا بہ ساحل بیقرار
دیکھ لے برق تجلی دیکھ لے — شوق میں ہے جذبۂ دل بیقرار

دیکھئے نیرنگی عالم کو شاد
جائیے منزل بمنزل بیقرار

معلومات

دنیا کی سب سے بڑی چیزیں کہاں ہیں

(مولانا محمد عمر انصاری)

دنیا کا سب سے بڑا **بینک** لندن میں۔ سب سے بڑا **اسپتال** پیرس میں۔ سب سے بڑا **کلیسہ** روما میں۔ سب سے بڑی **حجری عمارت** مصر میں۔ سب سے بڑا **پل** نیویارک میں۔ سب سے بڑا **مطبع** واشنگٹن میں۔ سب سے بڑا **جرس** اوس کا (جرمنی) میں (اس جرس کی بلندی ۲۶ قدم دائرہ ۸۰۴ قدم اور وزن ۷۴ ٹن ہے) سب سے بڑی **نہر** امریکہ میں (جو نہر ا زون کے نام سے مشہور ہے۔ اس نہر کا طول ۴ ہزار میل سے زاید تبلایا جاتا ہے) اور سب سے بڑا پہاڑ ہندوستان میں ہے۔

عکاس خانے یا سینما

دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں عکاسخانوں (سینما) کی تعداد حسب ذیل ہے۔

امریکہ (۱۸۰۰۰) جرمن (۳۷۲۱) روس (۳۵۰۰) برطانیہ (۳۲۰۰) فرانس (۲۴۰۰) ایطالیہ (۲۲۰۰) بلجیم (۸۰۰) سوئیڈن، ناروے اور ڈنمارک (۷۷۹) پولنڈ (۳۰۷) ہالنڈ (۲۲۷) اسپانیا (۱۵۶) ترکی (۲۳) آج کل ترکی میں عکاسخانوں کی روزافزوں ترقی ہورہی ہے۔ (گلشن فارسی)

حال ہی میں جریدہ **الفیہا** نے دنیا کے بعض بڑے شہروں کی آبادی کے متعلق جو اعداد شمار پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

لندن (۷۲۱۶۸۰۰) نیویارک (۵۹۰۰۴۸۰) برلن (۴ ملین) پیرس (۳ ملین) شکاگو (۲۷۰۱۷۰۵) ٹوکیو (۲۱۷۳۰۰۰)

دنیا کا طویل ترین نام

اسوقت دنیا کا طویل ترین نام چکاگو کے ایک شخص کا خیال کیا جاتا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

Gust, j, papa theodora Kawnoud urgisto mochala Kupulas.

گسٹ جے پاپا تہیوڈور کونڈ ورگسٹو مکالا کوپولس۔

حال ہی مین نیو یارک مین ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے۔ جو دنیا کی سب سے بڑی کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ کا طول ۱۰ قدم اور عرض ۷ قدم ہے

رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے حال ہی مین بدھ مذہب کی ایک قدیم دستاویز کا انکشاف کیا ہے۔ اس دستاویز پر چینی زبان مین ۹۷۵ء لکھا ہے۔

اسوقت دنیا کا سب سے بڑا وصیت نامہ فریڈرک ایلفی کول کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ وصیت نامہ کتابی صورت مین ۱۰۶۶ صفحات پر بسیط ہے۔ اور ہر صفحہ مین (۱۹۰) الفاظ ہین۔

ماچس کی ایجاد کو کامل ایک صدی کا زمانہ گذرا۔

دنیا مین جس قدر جرائد شایع ہوتے ہین۔ اس کا نصف صرف امریکہ سے شایع ہوتا ہے۔

انگلستان کے قدیم ترین" اسٹامپ کا رنگ کالا تھا۔

یوروپ مین سب سے پہلے پوسٹ آفس کا شعبہ ۱۴۶۲ء مین فرانس مین قایم کیا گیا۔ اس کے پہلے اسلامی حکومتون مین اس کا ایک خاص شعبہ ہوتا تہا۔

انسان ایک دقیقہ مین ۱۸ مرتبہ سانس لیتا

شیکسپیر نے اپنی مؤلفات مین ۵۰۰۰ مختلف الفاظ استعمال کئے ہین۔ حالانکہ ابھی تک کسی انسان نے اپنی زندگی مین ۴۰۰۰ ہزار الفاظ سے زاید نہین استعمال کئے۔

ایک گھوڑے کی طاقت انسان کی طاقت سے نسبتاً ۷ گن زائد ہوتی ہے۔

اگر ایک عورت کے سر کے بال ایک دوسرے سے جوڑ دئے جایئن تو اس کا طول ۶۰ میل سے زاید ہوگا۔

مکھی کو ۱۰ آنکھین ہوتی ہین۔ مکھی کی عمر پانچ سال سے زاید نہین ہوتی۔ مکھی ایک منٹ مین ۳۲۰ مرتبہ اپنے بازؤن کو حرکت دیتی ہے اور ایک کیلومیٹر مسافت طے کرتی ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟

یا آپ نے کبھی غور کرنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے کہ **ادبستان کی قیمت** بجائے ۶ آنہ فی پرچہ کے بمبئی مین صرف **۴ آنہ** فی پرچہ کیون رکھی گئی ہے؟ اور ہم یہ نقصان کیون برداشت کرتے ہین؟ محض آپکو فائدہ پہونچانے کے لئے۔ لہذا اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیجے۔ خرید کر فائدہ اٹھائیے

تعارف

حسن خیال اڈیٹر رضی کاکوری اور سرشار کسمنڈوی۔ مقام اشاعت دفتر حسن خیال منڈی سیہور ریاست بھوپال قیمت سالانہ دو روپے۔

یہ بزم شعرا کا ماہانہ ادبی رسالہ ہے جس مین بیشتر حصہ نظم کا ہوتا ہے۔ پرچہ زیر تبصرہ مین نثر کا صرف ایک مضمون ہے۔ جو ہر طرح قابل ستایش ہے نظمین بھی دلچسپ ہین۔ فی الجملہ رسالہ اچھا ہے۔ اور ایک قابل قدر کوشش ہے۔

امارت مدیر سید محمد عثمان غنی۔ مقام اشاعت پھلواری شریف پٹنہ قیمت سالانہ ؏ ششماہی ۱۲/ ایک پندرہ یومی اخبار ہے جس مین علاوہ اور دلچسپیون کے ہر قسم کی خبرین اور اطلاعات بھی ہوتی ہین۔ اہل بہار کو خصوصاً اسکی سرپرستی کرنی چاہیئے۔

ریاست اڈیٹر دیوان سنگھ مفتون۔ مقام اشاعت دفتر ریاست دہلی قیمت سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے۔

ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو ہر سنیچر کو شایع ہوتا ہے مضامین اعلیٰ۔ معلومات انوکھی۔ مقالات دلچسپ اور تصاویر دیدہ زیب و پسندیدہ ہوتی ہین۔ ہندوستان کے ہفتہ وار اخبارون مین ممتاز ترین اخبار ہے۔ لایق اڈیٹر نے مختلف النوع دلچسپیان جمع کرنے مین بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔

ہنٹر پنچ اڈیٹر عثمان محمد حاجی داداللہ۔ مقام اشاعت دفتر ہنٹر پنچ امام باڑہ بمبئی نمبر ۹ قیمت

سالانہ چار روپے۔ششماہی ڈھائی روپے۔ ایک مزاحی ہفتہ وار اخبار ہے جس مین تفنن اور تفریح کے کافی سامان موجود ہوتے ہین۔بمبئی کے لئے یہ کوشش لایق تحسین ہے۔

ماہر اڈیٹر حکیم محمود علی خان ماہر اکبرآبادی۔ مقام اشاعت فراشخانہ دہلی۔قیمت سالانہ چار روپے ششماہی دو روپے چار آنے۔

ایک ہفتہ وار اخبار ہے جس مین طبی معلومات کے اضافہ کے ساتھ تمام دلچسپیان جمع ہوتی ہین۔ حکیم صاحب کی یہ کوشش ہر طرح امداد کی مستحق ہے۔

الخلیل ایڈیٹر محمد خلیل الرحمن مقام اشاعت بجنور۔قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی ڈھائی روپے ہفتہ مین دو بار بجنور سے شایع ہوتا ہے۔ ایک اچھے اخبار مین جو خوبیان ہونی چاہئین وہ تمام موجود ہین۔ اہل ذوق حضرات کو اس کے ملاحظہ کی کوشش کرنی چاہیے۔

الکامل ایڈیٹر ابوعلی آزاد بہاری اور ابوالعلا بہاری مقام اشاعت دفتر چشمۂ کامل دہلی۔چندہ سالانہ عہ ہر قسم کے مضامین کا ایک ماہوار رسالہ ہے۔قیمت کے لحاظ سے ارزان ہے اور مضامین کے لحاظ سے اعلی۔ لایق ایڈیٹرونکو تھوڑی اور توجہ کرنی چاہیے۔

(خلیل احمد سبکروی)

تازہ بتازہ نو بنو

الحجاب

(از مولوی شیخ عباس صاحب)

اگرچہ یہ مسئلہ بہت فرسودہ اور پامال ہوچکا ہے۔ اور اسپر مشاہیر قوم نے اپنے زرین خیالات کا بارہا اظہار فرمایا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ ابھی تک اس قدر تشنہ اور غیر منفصل ہے کہ ابھی اسپر بہت کچھ لکھا جانا چاہیئے۔ مین چاہتا ہون کہ اسپر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ اسوقت اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالونگا۔

پردہ کے دو پہلو دکھانے سے اسکی پوری اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک پہلو تو ایجابی ہے۔ دوسرا سلبی۔ ہم اس موقع پر سلبی پہلو کے ایک عنوان پر بحث کرنا چاہتے ہین۔ سلبی پہلو مین پردہ اُٹھ جانے سے ایک خطرہ حیا کے اُٹھ جانے کے متعلق ہے۔ انسان خواہ وہ کسی قطعۂ ارضی کا بسنے والا ہو حیا کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔ کون نہین جانتا کہ عورت کا بہترین زیور حیا ہے۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو حیا ہی وہ زبردست قوت ہے جو عصمت کی دیوی کی نگہداشت اور رکھوالی کرسکتی ہے اگر یہ چیز نسوانی زندگی سے گم ہوجائے تو یہ کہنا بجا ہے کہ عورت زیور عورتیت سے عاری ہے۔ اگر ایک انسان اپنے جوہر اور اوصاف کم کرکے ترقی کرے تو درحقیقت وہ انسانی ترقی نہین ہے۔ اصلی ترقی تو وہ ہے جو حدود اخلاق اور اوصاف انسانیت کو قایم رکھتے ہوئے بلندی کی طرف قدم بڑھائے جائین۔ اگر مذکورہ بالا امور مسلم ہین تو ہمین ایک نظر اس طرف ڈالنی چاہیئے۔ کہ آیا بے پردگی سے یہ جوہر عورتیت زائل ہورہا ہے یا نہین۔ اگر ہم سرسری طور پر دیکھین تو آج یورپ اور دیگر غلط رو ممالک کے تلخ تجربات اور مثالین ہمارے لئے عبرتناک بصیرت کا سامان پیدا کررہے ہین۔

داستان آرزو

(از جناب غلام علی خان صاحب مانی بی اے اجمیری)

برق سوزان بر دیارم آرزوست — قلب بریان درکنارم آرزوست
التذاذِ انتظارم آرزوست — دلبرِ غفلت شعارم آرزوست
زیرِ سر چرخ چہارم آرزوست — تکیہ بر زانوئی یارم آرزوست
دل ز عشقش داغدارم آرزوست — منظرِ صد لالہ زارم آرزوست
جان و دل را مضطرب دارد سدا — آن خلش پروردگارم آرزوست
سبزہ زارم چشم دارد از خزان — بادِ صرصر در بہارم آرزوست
حاجتِ ہمدم ندارم نہ چراغ — شمع روئی بر مزارم آرزوست
بر جگر خوردہ خدنگ نیم کش — مثلِ ماہی بیقرارم آرزوست
جامِ صہبا را نمی خواہم مگر — یک نگاہِ مستِ یارم آرزوست
تا شود سیراب کشتِ تشنہ لب — چشمہائی اشکبارم آرزوست

بشنود مانی بخلوت او شبے
داستانِ حالِ زارم آرزوست

بظل حمایت
انجمن معین الادب

اردو علم ادب کی
دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

مقام اشاعت
عروس البلاد بمبئی

رجسٹرڈ نمبر ۲۱۵۰

بنام جہاندار جان آفرین
حکیم سخن بر زبان آفرین



جلد .... نمبر ۶

معاون
منیر الہ آبادی

مرتب
رشید صدیقی

معاون
خلیل احمد سیکروی

(کتبہ اثر دہلوی)

جلد ۱ **فہرست مضامین** نمبر ۶

تصاویر

(۱) مولانا شرر لکھنوی۔ مرحوم (۲) حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم (۳) فیصل ابن سعود (۴) شعیب قریشی (۵) بڑودہ کی دستکاری (۶) مسٹر غلام غوث (۷) یوروپین لیڈی غلام غوث (۸) موجودہ روسی خواتین کا پسندیدہ لباس (۹) کپتان ٹیور دہن افغانی ہوائی افسر

بزم ماتم

مولانا شرر و شاد مرحوم

یہ ضرور ہے کہ دنیا ہی آمد و رفت کا نام ہے۔ اس مادر گیتی نے ہزارہا انمول لعل و جواہر اُگلے اور پھر خود ہی ہضم کر گئی۔ ہر انسان جانتا ہے کہ دنیا کی کسی شے کو ثبات نہیں ؎

صبح کو طائران خوش الحان   پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

تاہم یہ قدرتی امر ہے کہ ہر حادثۂ جانکاہ پر انسانی قلوب کی دنیا مضطرب اور پریشان ہو جائے۔ درد و کرب میں۔ آہ و زاری، سوز و غم میں اشکباری، رنج و محن میں بیقراری کے اضطراری جذبات سے کسی انسان کو مفر نہیں۔ اگرچہ آج اردو کے سر سے شرر و شاد کا سایہ اُٹھ جانا مشیت ایزدی اور منشا خداوندی کے باعث ہے۔ اور قضا و قدر کے کاموں میں بے بس انسان کا چون و چرا کرنا ہی سوء ادبی سے خالی نہیں۔ لیکن پھر بھی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دنیائے اردو کو اور چند دن شرر و شاد کی ضرورت تھی۔ مگر افسوس پیک اجل کی روک تھام انسانی دسترس سے باہر ہے ؎

ہائے اے مرگ نہیں تجھکو کسی شے کی تمیز   تیری نظروں میں برابر ہیں گہر اور پشیز

شاد مرحوم کے حالات زندگی اگرچہ بہت تاریکی میں ہیں۔ لیکن اہل علم کی مجلسیں اور دل و دماغ انکی کاوشوں اور عطر بیزیوں سے نا آشنا نہیں۔ جناب شاد عظیم آبادی گذری ہوئی صحبتوں کی ایک تنہا یادگار تھے۔ جسکو اجل کے زبردست پنجہ نے ہم سے چھین لیا۔

مرحوم کا کلام اُستادانہ ہوتا تھا۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر ان کے اشعار رسایل میں طبع ہوا کرتے تھے لیکن ادھر کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ بالکل بند تھا۔ جو شاید کبر سنی اور ناسازی طبع کا نتیجہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ جناب شاد کی ایسی فقید المثال ہستی سے دنیائے ادب میں ایک عرصہ کے لئے کمی ہو گئی۔ اسکی پیشین گوئی

کے لئے بظاہر کوئی قرینہ نہین ہے کہ یہ جگہ اب کب پوری ہو گی ؟ غالباً اب تک جناب شاد کے کلام کا کوئی مکمل مجموعہ شایع نہین ہوا - کیا بہتر ہو کہ عقیدتمندان شاد مرحوم کی یاد مین ان کا پورا کلام ارزان سے ارزان قیمت پر اچھی طباعت و کتابت پر ملک کے سامنے پیش کرین اور عظیم آباد مین ایک ادبی مجلس قایم کرین -

مولانا شرر کے ناولون نے ملک مین جو ہر دلعزیزی و حسن قبول حاصل کیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہین - ان کی تصنیفات کو جس قدر لوگون نے دلچسپی اور شوق سے پڑھا ہے غالباً اتنے اشخاص کسی اُردو مصنف کے نام سے بہی آشنا نہ ہون گے - مولانا کو لوگ زیادہ تر صرف ایک ادیب اور ناول نگار کی حیثیت سے جانتے ہین - اگرچہ انکی علو مرتبت کے لئے صرف ناول نگاری کی جدید شاہراہ کی امامت کا امتیاز کافی سے زیادہ ہے - مگر جب ان کے اور حالات اور قابلیتون پر نظر ڈالئے تو اس بے بہا جوہر کی قدر و قیمت کا اندازہ وہم و قیاس مین بہی نہین آتا - مولانا مرحوم علامہ شبلی کے ہم درس رہ چکے ہین - ایک عرصہ تک باضابطہ عربی - فارسی تعلیم حاصل کی ہے مولانا کو دونون زبانون پر کافی عبور حاصل تہا - مرحوم اسلامی تاریخ سے خاص شغف رکہتے تہے - انہون نے اپنے اس مخصوص فن سے ہندوستان کے مسلمانون مین دلچسپی اور لگاؤ پیدا کرنا چاہا - چونکہ زمانہ کی رفتار سے واقف اور ادا شناس تہے لوگون کے مذاق کے مطابق کیفیات پر شکر کا ضماد ضروری سمجہا - اسلئے اپنے خالص جذبات تاریخی ناول کے رنگ اور شکل مین پیش کئے - اگرچہ اس ایثار سے انکی تصانیف کو وہ دوام نصیب نہین ہوا جو خالص تاریخی کتب کو حاصل ہو سکتا تہا تاہم یہ دوام ان کے لئے کیا کم ہے کہ تا حشر مسلمانان ہند کا تاریخی ذوق ایک بڑی حد تک شرر کا مرہون منت رہیگا - انہون نے مسلمانونکو صرف انکی گذشتہ عظمتون کے فسانے سنا کر ان کے ماضی سے روشناس نہین کرایا - بلکہ ہر موقعہ پر وہ کیرکٹر و اخلاق کی تعمیر کے خیال مین سرمست رہتے تہے - انہون نے اپنی اس دھن مین کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا پاس و لحاظ تک نہ کیا - ایسے ایسے نازک موقعون پر جبکہ حق گو زبانین گنگ ہو رہی تہین اخلاقی جراتین پست اور انسانی غیرت و حمیت کمزور ہو چکی تہین اپنے اس فرض کی ادائیگی مین ذرا بہی

تامل نہ کیا۔ اور اخلاقی درستگی کے لئے سخت سے سخت ناول لکھے جن سے انہین ایک موقعہ پر جان کا خطرہ بہی لاحق ہو گیا۔ مگر خدا کے سچے بندہ کو ظاہری اور مادی قوتون کا کیا اندیشہ ہو سکتا تہا۔ ع

آنکس کہ ترا شناخت جان راچہ کند   فرزند و عیال خانمان راچہ کند

مولانا شور و شغب سے ہمیشہ علیحدہ رہے ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء کا پر آشوب اور ہنگامہ آرا زمانہ آیا اور گذر گیا لیکن مولانا اپنے خاموش کام مین مشغول رہے۔ البتہ اب آخر آخر مین حجاز کے معاملات سے بیچین ہو کر اسلامی سیاست مین حصہ لینے لگے تہے۔ اور لکھنؤ کے متعدد جلسون مین شرکت بہی کی اکثر جلسون مین تحریری لکچر بہی دیتے تہے۔ آخر وقت تک چہرہ پر رونق اور نور تہا۔ باوجود کبر سنی کے اپنے کامون مین بہت چست اور پابند رہتے تہے۔ ہمیشہ قلم و قرطاس سے تعلق رہا۔ باوجود تبحر علمی کے طبیعت نہایت سادہ پائی تہی۔ ہر شخص سے اخلاق سے ملتے اور ہر بات مین انکسار اور فروتنی ظاہر فرماتے انصاف پسندی طبیعت مین بے حد تہی۔ اگرچہ وہ علامہ شبلی سے اعتزال کے باعث بعض باتون مین اختلاف رکہتے تہے لیکن علامہ کے اعتراف مین کبہی بخالت یا تنگ دلی سے کام نہین لیا۔

تقریباً دو سال قبل "معارف" اور "اردو" مین شعر العجم پر بحث چہڑ گئی تہی جس مین "اردو" نے مولانا کے نزدیک بعض باتون مین زیادتی کی تہی انہون نے بلا کسی خیال کے اہل شبلیؒ اور شبلیؒ کی حمایت کی اور "اردو" والونکو ان کی غلطیان بتلائین۔

اب یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسنون کی اگر چین حیات نہین تو کم از کم بعد مرگ ہی ہی قدر و قیمت کرے۔ مرحوم کی یادگار رسالہ دلگداز زندہ رکہنے، انکی آفریدہ شاہراہ کے راہرو پیدا کرنیکی کوشش کرے۔ ہم یہ اپیل تو کر رہے ہین لیکن کارکنون کی بے عملی اور قوم کی سرد مہری نے پچھلے ریفارمرون اور مشاہیر کے ساتہہ جو دردناک سلوک کیا ہے اُسے دیکہکر دل سرد ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا غالب مرحوم کی قبر کی مرمت کے لئے تحریک ہوئی تہی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جائے شکر ہے کہ کسی خدا کے بندے نے کم از کم غالب کے مزار کو بے نشان ہونے سے بچا لیا۔ اور ضروری مرمت کر دی ہے۔

حال مین سرفراز لکھنؤ نے یہ خبر دی تہی کہ انہیں مرحوم کی یادگار ایک بوسیدہ عمارت پر

بننے کی ترقی آرہی ہے۔ اگر رقم ادا نہین کی گئی تو انیس کے ساتھ یہ انکی آخری یادگار بھی پیوند زمین ہوجائیگی۔ کیا حضرت انیس مرحوم کے ہم پر اتنے احسانات نہین ہین کہ ہم ان کی موروثی زمین کی حفاظت کرکے کوئی علمی یادگار قایم کردین۔

ان اکابرین قوم کے ساتھ یہ بے توجہی دیکھکر کسی جدید تحریک کوجی تو نہین چاہتا مگر ہمارے سامنے مولانا شرر کے صاحبزادے کا اعلان ہے کہ وہ والد مرحوم کی جگہ سنبھالینگے اور سوانح زندگی ورسالہ دلگداز کی اشاعت جاری رکھینگے اس لئے اس موقعہ پر اتنا عرض کرنا چاہتے ہین کہ مسلمانون کو موصوف کی حوصلہ افزائی مین دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

آخرمین دعا ہے کہ خدا مرحومین کو جوار رحمت مین جگہ عطا فرمائے اور قوم کو بدل۔

(ہمنر الہ آبادی)

نمونۂ کلام

خانبہادر سید علی محمد شاد مرحوم۔ عظیم آبادی

کب سے پکارتا ہون جوانی کدھر گئی
کیا زندگی کی راہ مین کمبخت مرگئی

ناحق ہے دلکو صبح شب غم کا انتظار
تھوڑی سی اب ہے رات بہت کچھ گذر گئی

عمر رواں کی تیز روی کا بیان کیا
اک برق کوندکر ادھر آئی ادھر گئی

اس سے تو تھا مرے لئے بہتر کہین عدم
دو دن کی زندگی مجھے بدنام کرگئی

اے شاد کیا کہون تری شیرین بیانیان
جو بات تونے کی مرے دل مین اُتر گئی

بزم ادب

جنوری ۱۹۲۷ء کی پہلی اور دوسری تاریخون مین کوکن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ کانفرنس کی تمام کارروائی بزبان اُردو عمل مین آئی۔ جو نہایت مسرت کی بات ہے۔ اس کانفرنس نے مسلمانون کی تعلیم کے سلسلہ مین اسوقت تک صرف دو کام انجام دئے ہین۔ ایک تعلیمی پروپگنڈا جو بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اور دوسرے وضایف۔ جنکی مجموعی رقم تقریباً سولہ سو روپیہ سالانہ ہے۔ ممکن ہے کہ ملک کی دوسری کانفرنسون اور مجالس تعلیمی کی سرگرمی کے سامنے اس کانفرنس کی خدمات ہیچ معلوم ہون۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس حصۂ ملک کے لئے یہ ہی بسا غنیمت ہے۔ ہم اُمید کرتے ہین کہ اہل کوکن اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے اس مین کافی دلچسپی لین گے۔

سوامی شردھانندجی کی افسوسناک موت ایک ملکی حادثہ ہے۔ جس کا اثر ہر حصۂ ملک پر پڑا۔ شروع شروع کی جھوٹی سچی افواہون نے ہندو مسلم تعلقات مین سنسنی پیدا کر دی تھی۔ جس نے بعض مقامات پر بدمزگی کا رنگ اختیار کر لیا۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ بمبئی کے دوراندیش ہندوؤن اور مسلمانون نے نہایت صبر و سکون سے کام لیا۔ اور محض نادانی کی بنا پر فضا کو مکدر کرنے کی کوشش نہین کی۔

حج کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ باب الہند بمبئی مین اللہ کے مہمانون کی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے اب تک مسلمانان بمبئی نے اسطرف جیسا کچھ حق ہے توجہ نہین کی۔ یہی سبب ہے کہ حاجیون کو بہت سی تکالیف بلاوجہ اُٹھانی پڑتی ہین۔ بمبئی کا بہیارہ۔ جہاز پر سامان چڑہانے اتارنے کے مصایب اور کامران کا قرنطینہ بالکل غیر ضروری ہین۔ اخبارات کے ذریعہ ان تمام مشکلات کے متعلق بار بار تفصیلی بیانات پبلک مین

آچکے ہین۔ لیکن افسوس کہ اسوقت تک کوئی عملی صورت ان کے دور کرنے کی نہین نکالی گئی معلوم ہوا ہے کہ کراچی کے مشہور محب وطن سیٹھ عبداللہ ہارون اس مسئلہ کے متعلق اسمبلی مین سوالات کرینگے خدا کرے ان کی کوشش بارآور ہون۔ مسلمانونکو چاہیئے کہ اس موقعہ پر انکی پوری امداد اور پرجوش تائید کرین۔

اس ماہ بمبئی کی خاص دلچسپیون مین مولانا محمد علی صاحب قصوری ایم۔ اے (کنٹب) اور مسٹر شاپورجی سکلتوالا ایم پی کی تقاریر قابل ذکر ہین۔ اول الذکر مولانا نے قرآن پر لکچرز کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جو زبان انگریزی ہوتے ہین۔ سامعین مین ہر قوم وملت کے لوگ ہوتے ہین۔ یہ سلسلہ بیحد مفید اور ضروری ہے۔ موخرالذکر مسٹر نے اگرچہ اپنی تقاریر کا موضوع سرمایہ داری اور مزدوری قرار دیا ہے۔ تاہم درمیان مین تعلیم اور تنظیم وغیرہ کے متعلق نہایت اعلی خیالات کا اظہار کر جاتے ہین جو ہندوستان کی آیندہ نسل کے لیئے نہایت ضروری ہین۔ مسٹر سکلتوالا کا طرز تقریر پرجوش اور موثر ہے،

انجمن معین الادب نے فی الحال اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے ماہانہ علمی جلسون کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ہر ماہ کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو بار بمبئی کے علم دوست احباب جمع ہوتے ہین۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ مختلف دلچسپ اور سبق آموز مضامین سناتے ہین اگرچہ اس طریقہ نے کافی مقبولیت حاصل کرلی ہے اور جو رونق ان جلسون مین نظر آتی ہے وہ بمبئی کے مسلمانون کے کسی اور اجتماع مین بمشکل ملیگی۔ تاہم یہان کی آبادی کو دیکھتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہین کہ اسے اور وسیع ہونا چاہیئے کیا بمبئی کے اہل ذوق حضرات ہماری ناچیز درخواست پر توجہ فرمائینگے۔

محترمی رشید صدیقی صاحب اڈیٹر ادبستان اب بفضلہ رو بہ صحت ہین لیکن طبی مشورہ کی بناء پر ابھی تک تحریری مشاغل سے علیحدہ ہین۔ توقع ہے کہ آیندہ رسالہ موصوف ہی کی زیر نظر

شایع ہوگا۔

ہمیں افسوس ہے کہ جناب اسلامی کی غیر متوقع علالت کی وجہ سے ناظرین ادبستان مراٹھی تراجم سے اس مرتبہ بھی لطف اندوز نہ ہو سکے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ خداوند کریم صاحب موصوف کو جلد صحت کلی عطا فرمائے۔ آمین

حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کی تصویر زیب وہ ادبستان ہے۔ اس لئے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ مرحوم کے کلام بلاغت نظام سے ناظرین ادبستان کو روشناس کرائیں۔ صفحہ ۶ پر مرحوم کا کلام ہدیۂ ناظرین ہے۔

ہم نے یہ اطلاع نہایت رنج وغم کے ساتھہ سنی کہ محترمی مولانا محمود اسرائیلی کی دو صاحبزادیوں نے پے در پے پندرہ روز کے عرصہ میں انتقال فرمایا صاحب موصوف کے دل و دماغ پر اس حادثۂ جانکاہ کا جو اثر پڑا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ خدائے کریم مرنیوالیوں کو غریق رحمت کرے اور مولانا و دیگر اعزا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(منیر الہ آبادی)

نظیر اکبر آبادی

از مولانا حاجی قمر احمد صاحب بی اے ایل۔ ایل بی اڈیٹر روزنامہ خلافت

یہ اسپ بہت اچھلا کودا اب کوڑا مارو زیر کرو،
جب مال اکٹھا کرتے تھے اب تن کا اپنے ڈھیر کرو،

تحریک ترک موالات کے زمانۂ شباب مین ملک کے بہت سے لیڈر اور قومی کارکن جیل مین تھے اس زمانہ بین مجلس خلافت نے دوسرے کامون کے ساتھ ساتھ یہ بہی کام اپنے ذمہ لیا تہا کہ بمبئی کے گرد و نواح بین جو اسیر تھے اُن کی تفریح طبع کے لئے مختلف قسم کی کتابین بہیجی جاتی تہین۔ ان مین زیادہ تر کتابین تو لائٹ لٹریچر کی ہوتی تہین۔ تاکہ اسیری کی مشقت سے دماغ پر زیادہ بار نہ پڑے۔ بہت سی ایسی کتابین بھی ہوتی تہین جو یہ قومی اسیر خود فرمایش کرکے منگاتے تہے۔ اُن کی فرمایشون کا پورا کرنا ہمارا فرض اولین ہوتا تہا۔ اور اس لئے علاوہ خریداری کے بمبئی۔ لکھنؤ، دہلی، اور دوسری دوسری جگہون کے اہل علم سے بہی یہ کتابین منگائی جاتی تہین۔ بہت سے وطن کے شیدائی خود کتابین دے جاتے تھے چنانچہ مجھے خوب یاد ہے کہ مانڈوی کانگریس کمیٹی کے سکرٹری بہائی ہیبشری کے ذریعہ سے ایک محب وطن ڈاکٹر نے جن کا نام زبان پر ہے مگر حافظہ کی خرابی اسوقت یاد دلاکر اُسے زبان تک نہین لانے دیتی۔ ڈاکٹر ''ورا'' کا نام تو یاد ہے مگر دوسرے محب وطن ڈاکٹر صاحب کا نام اب بہی یاد نہین آتا۔ بہت سی کتابین اس مد مین دی تہین۔ بہرحال سب سے زیادہ مشکل فرمایشین مولانا محمد علی کی ہوتی تہین۔ کیونکہ آپ اسلام اور مسیحیت دونون کا بہ یک وقت مطالعہ فرماتے تہے۔ خیر ان کی فرمایشین تو میرے ناچیز مبلغ علم سے ذرا اونچی تہین۔ مگر دوسرون کے متعلق مجھے بیحد دلچسپی رہتی تہی کہ کون کس قسم کی کتابین منگاتا ہے۔ اور تنہائی کے گھنٹون مین ہم لوگ ہر ایک کے ذوق سلیم پر تبصرہ کرتے۔ کسی کو

داد دیتے اور کسی پر ہنس دیتے تھے۔ مگر یہ ہنسی طنز یا حقارت کی نہ تھی بلکہ دراصل اس اظہار کی تھی کہ ہم نے اُن کا اصلی مذاق معلوم کر لیا۔ اب اگر فرمائشیں نہ بھی ہوں تو بھی ان کے پسند خاطر کتابیں بھیجدی جایا کرتی تھیں۔

سب سے زیادہ سیدھی سادی فرمایش چودھری عبدالغنی صاحب کی تھی وہ تو فیصلہ سننے سے پہلے ہی طلسم ہوشربا کی دو جلدیں پسند کر چکے بلکہ لے چکے تھے۔ اور چونکہ غم غلط کرنے کی اس سے آسان ترکیب دوسری نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے ہم لوگوں نے بھی اسے پسند کیا کہ سستے چھوٹے۔ اگرچہ اس کا مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اسے ایک دن بھی پڑھا نہ ہوگا۔ کیونکہ میں ان کی اُفتاد طبع سے کچھ نہ کچھ واقف تھا

سب سے زیادہ دلچسپ اور مختلف النوع مولانا شوکت علی صاحب کی فرمایشیں تھیں۔ سیرت نبوی صلعم مرتبہ مولانا شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی۔ دیوان داغ (مکمل) انقلاب فرانس۔ دواوین امیر مینائی۔ غالب ظفر وغیرہ یعنی ایک تھوس اور کار آمد کتاب اور دوسری دل بہلانے والی شعر و شاعری کی کتاب یہاں تک تو خیر سمجھ میں آتا تھا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ یہ کہ مولانا نے دیوان نظیر اکبرآبادی کس وجہ سے طلب کی تھی۔ اتفاق سے اُس زمانہ میں انکی کلیات ملی بھی نہیں جو اُسے دیکھ کر رائے قایم کرتا پھر کوئی ایسی اہم بات بھی نہ تھی جو اسکی جستجو کرتا۔ مگر یہ خیال اکثر دل میں کھٹک پیدا کرتا۔ ۱۹۲۲ء کا یہ واقعہ ہے۔ اب پانچ سال کے بعد ۱۹۲۷ء میں ایک روز مسٹر ریاض الحسن نے پرانی کتابوں میں سے نکال کر یہ کلیات دی کہ لیجئے بہت دنوں سے آپ کو اسکی تلاش تھی جی بھر کے دیکھ لیجے۔ چنانچہ میں نے فرصت کے لمحوں میں اسے دیکھنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ اس کی وہ کونسی ادا تھی جس کے لئے مولانا نے اسے جیل میں منگوایا تھا۔ نظیر اکبرآبادی کے کلام سے میں خود بیگانہ نہ تھا متعدد نظمیں دیکھی تھیں اور ان کی پرگوئی وسعت نظری اور اس کے ساتھ سادگی کا پہلے سے قایل تھا۔ مگر میں یہ جانتا تھا کہ مولانا شوکت علی اشعار تو خوب یاد رکھتے اور لطف لیکر پڑھتے ہیں مگر شاعر نہیں اس لئے محض شاعرانہ التزامات انہیں اپنی طرف مایل نہیں کرسکتے۔ اور جب تک اس میں کوئی خاص چٹخارا نہ ہو وہ اس کے منگانے کی زحمت گوارا نہ کرتے۔

بارے دیکھتے دیکھتے وہ بات ذہن میں آ گئی اور پھر تو خوب ہی لطف آیا اور میں چاہتا ہوں کہ اس لطف میں ناظرینِ ادبستان کو بھی اپنا شریک بناؤں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آج اس ملک میں ایک ہی چیز کی کمی ہے اور اُسی کے لئے ہر شخص کوشاں ہے یعنی مختلف جماعتوں کا اتحاد۔ آج شیعہ اسنی، ہندو مسلمان سکھ برہمن۔ غیر برہمن سب آپس میں ایک دوسرے سے بدظن ہیں اور ہمارے رہنمایانِ قوم کی کوشش ہے کہ کسی طرح اتحاد و اتفاق قائم ہو جائے۔ نظیر اکبر آبادی کے دیوان سے خاص سبق یہی ملتا ہے کہ بیگانگی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندو مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے جذبات، احساسات، مذہب۔ علم ادب اور تمدن سے ناواقف ہیں اس لئے آپس میں بیگانگی پیدا ہے۔ آج مسلمانوں کو جس درجہ ہندوؤں اور سکھوں کے مذہب روایات اور جذبات سے بیگانگی ہے اُس سے کہیں بڑھی ہوئی بیگانگی سکھوں اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے مذہب، روایات اور احساسات سے ہے یہی سبب ہے جو مسلمان ؏

"میرے مولا بلا لو مدینے مجھے"

فرطِ جوش میں گنگناتا ہے تو ہندو اور سکھ چونکے ہوتے ہیں کہ آخر مدینہ سے مسلمانوں کو کیا تعلق ہے۔ اسی طرح جب ہندو

"چلو گوئیان آج کھیلیں ہوری رے کنہیا گھر"

گاتا ہے۔ یا سکھ .... ست سری اکال، جو بولے سو نہال"............ کے نعرے لگاتا ہے تو مسلمان بیگانہ وار منہ تکتا ہے۔ اگر آج ایک دوسرے کے لٹریچر، روایات اور حالات سے واقفیت ہوتی تو بہت سی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں رفع ہو جاتیں۔

یہیں پر یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کلیاتِ نظیر سے مجھے یہ بات کیونکر معلوم ہوئی۔ کلیات میں تو کوئی قومی نظم نہیں ہے یہ صحیح ہے۔ مگر واقعہ یہ ہوا کہ میں نے کلیات شروع ہی کی تھی کہ ایک کرمفرما نے کہا کہ نظیر اکبر آبادی شیعہ مذہب تھے۔ اتفاق سے میں جناب عباس علمبردار کربلا علیہ السلام کی منقبت پڑھ رہا تھا۔ خیال ہوا کہ ہوگا۔ اسوقت تو یہ بات گئی گذری ہوئی۔ مگر دوسرے وقت

اتفاقیہ نظر اس نظم پر پڑی جس مین شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح ہتی تو مجھے حیرت سی ہوگئی اس لئے کہ ایک مولوی صاحب سے سنا تہا کہ جہانگیر نے ایک شیعہ مجتہد کو محض اس لیے سزا دی ہتی کہ انہون نے شیخ سلیم چشتی کو برا بہلا کہا تہا۔ اس نظم کو پڑہکر مین نے یہ خیال قایم کیا کہ پہلی بات جو میرے کرمفرمانے ان کے شیعہ ہونے کے متعلق کہی ہتی وہ صحیح نہ ہوگی۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مینے گرو نانک۔ سری کرشن جی۔ مہادیوجی وغیرہ کی بہی شان مین ایسی عمدہ نظمین دیکہین جسے پڑہکر اس زمانہ مین حیرت ہوگی۔ کہ ایک مسلمان نے ان خیالات کا اظہار کیونکر کیا۔ اور کنہیاجی کی پیدایش، طفلی، عنفوان شباب، اور شادی کا حال پڑہکر تو بیساختہ زبان سے نکلا کہ نظیر ایک آل انڈیا شاعر ہے۔ اور اُس زمانہ کی ایک آخری یادگار ہے جبکہ ہندو، مسلمان، سکہہ، سب بلا امتیاز ملت و مذہب ایک دوسرون کے بزرگون کی عزت کرتے تہے۔ اور ایک دوسرے کے تہوارون کی خوشیان مناتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی مرحوم کو کیا معلوم تہا کہ اُن کا کلام ایسے دونکی تسکین کا باعث ایک ایسے زمانہ مین ہورہا ہے جبکہ تیوہار کا نام آتے ہی خواہ وہ کسی کا تیوہار ہو دل دہڑک اُٹھتا ہے کہ خدا اسے خیر و عافیت سے کاٹے۔

مین اس کے کلیات سے جستہ جستہ نظمین پیش کرکے اپنے ہندو، مسلمان، سکہہ بہائیون سے پوچھونگا کہ آیا یہ صورت اچھی ہے جو نظیر اکبرآبادی نے پیش کی ہے یا وہ صورت جو آج کل کے سماجی اُپدیشک، یا مسلمان مناظر پیش کررہے ہین اور جس مین بجز اس کے اور کچھ نہین ہوتا کہ ایک دوسرے کے بزرگون، اور مذہبی پیشواؤن کو گالیان دی جائین اور مذہب کا مذاق اُڑایا جائے مین تو اپنے ہندو اور مسلمان دونون بہائیون سے کہون گا کہ وہ کفر توڑ، اور رنگیلا رسول دونون کو نذر آتش کرین اور میان نظیر کے اُن مرنجان و مرنج اشعار سے لطف اُٹہائین جس مین محبت اور پیار کے سوا اور کچھ نہین۔

حمد باری تعالےٰ

الٰہی تو فیاض ہے اور کریم
الٰہی تو غفار ہے اور رحیم

مقدس معلیٰ منزہ عظیم — نہ تیرا شریک اور نہ تیرا سہیم
تری ذات والا ہے یکتا قدیم

نعت سرور کائنات

قبلۂ اہل یقین ہو یا محمد مصطفےٰ — رحمۃ للعالمین ہو یا محمد مصطفیٰ
جس جگہ وہم ملایک کو نہیں ملتی ہے جا — وان کے تم مسند نشین ہو یا محمد مصطفیٰ

منقبت پنجتن پاک

جواہر خانۂ قدرت کے اندر — یہی پانچون گہر ہین پنجتن پاک
نظیر اپنے کی وان بھی رکھیو عزت — خداوندا بحق پنجتن پاک
دونون جہاں کے گوہر انور کو کیا کہون — حیرت مین ہون کہ حیدر صفدر کو کیا کہون

مدح حضرت شیخ سلیم چشتیؒ

مقبول خاص یزدان حضرت سلیم چشتی — سردار ملک عرفان حضرت سلیم چشتی

بیان عرس شیخ سلیم چشتیؒ

رشک ہے گلشن بہشتی کا — عرس حضرت سلیم چشتیؒ کا

مدح نانک شاہ گرو

ہین کہتے نانک شاہ جنہین وہ پورے ہین آگاہ گرو — وہ کامل رہبر جگ مین ہین یون روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید بھی بر لاتے ہین دلخواہ گرو — نت لطف و کرم سے کرتے ہین ہملوگونکا خریاہ گرو

اس بخشش کے اس عظمت کے ہین بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

اس پوری نظم کو پڑہ جائیے صاف معلوم ہوگا کہ کوئی عقیدتمند سکھہ گرو جی کی تعریف کر رہا ہے سکھہ بہائیون کو اس نظم مین خاص لطف آئیگا۔

تعریف گرو گنج بخش

اے دل ہمیشہ نام گرو گنج بخش کا　　رکھ دہیان صبح و شام گرو گنج بخش کا
سیوک کو اپنے کرتے ہین اک آن مین نہال　　بخشش مین ہے یہ کام گرو گنج بخش کا
ارداس کر کے سر کو جھکا ان کے در پہ تو　　لطف و کرم ہے عام گرو گنج بخش کا

درگا جی کے درشن

پرسند بہت من ہوتے ہین یہ ریت رچی ہے پرسن کی　　تعریف کہون مین کیا کیا کچھ اب درگا جی کے درشن کی

تعریف بھیروں کی

تیری سرن گئی ہے کر تو نہال بھیرون　　اے پریتال دیوت مدہ مست کال بھیرون

بم شنکر ہری ہری

جب آنسا بینتا دور ہوئی اور آئی گت سنتہو کیہری　　سب چین ہوئے آنند ہوئے بم شنکر بولو ہری ہری

مہادیو جی کی بارات کا ٹھاٹھہ

جب بیٹھے شیو کی شاہی مین کل ۳۳ کروڑ جو ہین دیوتا　　بشن آپ تہی آگے اور برہما اور اندر نارد منی ان جا

اورمنگل اور برہسپت ہی اور نانون سینچر ہے جن کا وہ روپ سروپ وہ پوشاکین وہ اونچی شانین زیب فزا
اسوقت خوشی سے مسند پر شیو بیٹھے بنکر یون دولہا مکہہ پان کی لال کرے مہندی اور آنکہون بیچ لگا گجرا
یہ ٹہاٹہہ بنا کر دکہلایا جب شیو نے مایا اپنی کا ہر جا پہ طرف آنند ہوئے غل شور ہوا خوش وقتی کا

کنگ اڈورڈ میموریل اسپتال بین ایک نوعمر چھتری مجہے اکثر رات کے سناٹے مین مہا دیو جی کے بیاہ کی کہانی سناتا تہا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم دیکھنے کے بعد مجہے اُس نوعمر چھتری کے جذبات اور احساسات اکثر یاد آتے ہین۔

کرشن جی کی پیدائش کا حال

پہر آیا وان اک وقت ایسا جو آئے گربہہ مین موہن گوپال منوہر مرلی دہر سری کرشن کشورن کیول نین
گنشام مراری بنواری گردھاری سندر شیام برن پرہونا تہہ بہاری کان للا سکہہ دائی جگ کے دکہہ بہنجن
جب ساعت پرگہٹ ہونیکی وان آئی مکٹ دہرنا کی اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کرشن کنہیا کی

کرشن جی کا بچپن

ایسا تہا بانسری کے بجیا کا بانکپن کیا کیا کہون مین کرشن کنہیا کا بانکپن

بانسری کی تعریف

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری ایسی بجائی کرشن کنہیانے بانسری

مین نے نمونہ کے طور پر ایک ایک شعر دیدئے ہین۔ مگر اغیر اس خیال سے کہ ناظرین کے سامنے ان سب کا ماحصل پیش کر دیا ہے۔ ایک طویل نظم کے چند اشعار ہی دیدئے جاتے ہین۔ سنئے اور سمجہئے ۔؎

جاتا ہے حرم مین کوئی قرآن بغل بیچ کہتا ہے کوئی دیر مین پوتہی کی سماچار
پہونچا ہے کوئی پار بہٹکتا ہے کوئی وار بیٹھا ہے کوئی عیش مین پہرتا ہے کوئی زار

عاجز کوئی بکیس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار   مفلس کوئی ناچار تونگر کوئی زردار
زخمی کوئی ماندا کوئی اچھا کوئی بیکار   جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہین سب اسرار

ہر آن مین ہر بات مین ہر ڈہنگ مین پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ مین پہچان

عید، شب برات، ہولی، بسنت، جاڑون کی بہار۔ برسات کا سمان، دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ، اور مذاقیہ مین تربوز، ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ وغیرہ یہ توسب ہین ہی۔ مگر اس ہندوستان کے آخری دور کے واقعی قومی شاعر نے رواداری اور ہندوستان کی دوسو سال پیشتر کی پرلطف زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے اُسے پڑہکر کلیجہ پر ایک سانپ لوٹ جاتا ہے۔ آج عبادت، اور مذہبی جلوس مین لاٹہیان اور ڈھیلے چلتے ہین۔ مگر ایک زمانہ اس بدبخت ملک مین ایسا ہی گذرا ہے جبکہ ؎

گاتا تہا کوئی شعر تو کرتا تہا کوئی حال   چھانے تہا کوئی خاک اُڑاتا تہا کوئی حال
ناچے تہا کوئی شوخ بجاتا تہا کوئی تال   پہنے تہا کوئی جہنجہرے اوڑہے تہا کوئی شال
کرتا تہا کوئی ناز دکہاتا تہا کوئی بال   جب غور سے دیکہا تو اسی کی ہے یہ سب چال

بہلا آج تو کوئی گاتا بجاتا نکل جائے وہی مسلمان جن کے بزرگ اپنے جسم مین چبہے ہوئے دوشاخہ تیر کے نکالنے کیلئے یہ کہتے تہے کہ جب مین نماز مین کہڑا ہوؤن تو اُسے نکال لینا۔ تیر نکل جاتا تہا اور عاشق اللہ کو خبر ہی نہ ہوتی تہی۔ مگر آج وہی مسلمان خفا ہو جائینگے کہ نماز مین خلل پڑا۔ کیا یہ باعث افسوس نہین کہ جن کے نعرہ اللہ اکبر کی صدا سے دشت وجبل گونج اُٹھتے تہے آج وہ دوسرون کے ڈہول دماموں پر چڑہتے ہین۔ اور اسے بہول جاتے ہین کہ سچے مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب وہ اپنے مالک کے حضور مین کہڑا ہوتا ہے تو دنیا کا کوئی لہو ولعب اسکے خیالات کو منتشر نہین کرسکتا۔ وہ ان بزرگ کے واقعہ کو بہول جاتے ہین جن کے سامنے سے نماز مین اونٹ نکل گیا اور انہین خبر تک ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ زمانہ نے ہمین اپنا کرلیا ہے اس لئے ہم مین نفسانیت ترقی پاگئی ہے اور یہی ساری خرابی کا باعث ہے ؎

ہماری روح تو پہرتی ہے معشوقون کی گلیون مین   نظیر اب ہم تو مرکر ہی نہ اس جنجال سے چھوٹے

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

(مختصر سوانح حیات)

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنؤ کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام نامی حکیم تفضل حسین تھا جو سرکار اودھ میں شرف باریابی رکھتے تھے ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور کے بعد جب اودھ کی قسمت نے پلٹا کھایا اور سلطنت کے آخری تاجدار (نواب واجد علی شاہ) نے کلکتہ کے مٹیا برج کو رونق زندان بخشی تو ان بیشمار ہمراہیان و وابستگان میں آپ کے والد حکیم صاحب بھی تھے جو غربت میں بھی جان عالم کے ہمرکاب رہے۔ اسی زمانہ یعنی ۱۸۶۰ء میں مولانا شرر بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ جب آٹھ سال کی عمر ہوئی تو آپ کے والد ماجد نے آپ کو اپنے پاس کلکتہ بلا لیا۔ یہاں سے آپ کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوا جو تمام عمر نہ ختم ہوا۔ مولانا مرحوم علوم مذہبی کے علاوہ انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی تو اپنے قیام کلکتہ کے زمانہ میں ہی سیکھ لی تھی۔ البتہ فرانسیسی انگلستان میں سیکھی۔ جہاں آپ ۱۸۹۳ء میں تشریف لے گئے تھے مرحوم نواب عماد الملک بھی فرانسیسی کے ماہر تھے۔ مولانا مرحوم نے نواب مرحوم کی فرانسیسی زبان کی اکثر تعریفیں کی ہیں۔

مولانا مرحوم کا نظم و نثر میں جو پایہ تھا وہ موجودہ دور میں بہت کم ہستیوں کو میسر آسکا ہے آپ کی باضابطہ علمی و ادبی خدمات کا زمانہ ۱۸۸۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ آپ نے اودھ اخبار میں بحیثیت نائب مدیر کام شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے "محشر" نامی ایک ہفتہ وار اخبار جاری فرمایا جس نے بہت قلیل عمر پائی پھر ۱۸۸۷ء میں رسالہ دلگداز کا اجرا ہوا جو آج بھی مولانا کی یادگار ہے۔

۱۸۹۱ء میں آپ پہلی بار حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں آپ کی خاطر خواہ قدر و منزلت ہوئی۔ وہیں سے ۱۸۹۳ء میں آپ انگلستان چلے گئے۔ واپسی پر زیادہ عرصہ تک وہاں قیام نہ فرمایا اور لکھنؤ چلے آئے۔ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں آپ کی دوبارہ طلبی ہوئی اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات

مقرر ہوئے۔ لیکن یہ قیام دیر پا ثابت نہ ہو سکا کہ بعض وجوہ کی بنا پر آپ لکھنؤ چلے آئے مگر وظیفہ برابر جاری رہا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۲۶ء کو آپ پر فالج کا اثر ہوا۔ اور اسی مرض میں صرف تین روز مبتلا رہ کر ۲۴ دسمبر بروز جمعہ صبح کے وقت راہی ملک عدم ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلیہِ راجِعُون"

امیر خسرو

خسروِ عالم، سخن خسرو — مایۂ نازشِ وطن خسرو
تن شعر انوری و سعدی جان — جامع ہر دو جان و تن خسرو
ساغرِ تشنگی، دلِ گویا — ساقی بادۂ سخن خسرو
بندۂ خواجہ نظام الدین — فخر ہر خسرو سخن خسرو
فارغِ فکرِ ما سوائے خدا — تارکِ ذکرِ ما و من خسرو
عندلیبانِ خوش نوا صدہا — گلِ یکتائی سخن خسرو
حق کہ دعوائے ہمسری باطل — حق کہ یکتائے اہل فن خسرو
سخنش جلوۂ گلِ معنی — چمنِ شاہدِ سخن خسرو
سخنِ راست بے سخن گویا
سخنِ خسروِ سخن خسرو

(گویا)

ہندوستان اور چین

(خلیل احمد سیکروی)

تاریخ ہند کا تعلق تمام ایشیا کی تاریخ سے ہے۔ زمانۂ قدیم سے قومون کی نقل وحرکت اور اُن کے رسوم ورواج کا اثر دوسری ہمسایہ قومون پر پڑتا چلا آیا ہے۔ ہندوستان اس اثر سے باوجود دشوار گذار قدرتی حدود کے محفوظ نہ رہ سکا۔ آج بھی ہندوستان کا تعلق ایشیا کے دیگر حصص سے وہی ہے اور ہونا چاہئے۔ فی الحال ہمسایہ ممالک مین چین ہمین اپنی طرف متوجہ کرنے کا زیادہ سامان رکہتا ہے۔

اگرچہ گذشتہ چند صدیون نے چین و ہندوستان کے تعلقات ماضی کو فراموش کر دیا ہے تاہم تاریخ کے صفحات تبلا رہے ہین کہ چین جس نام سے آج دنیا اسے یاد کر رہی ہے سنسکرت کے لفظ "سین" سے نکلا ہے۔ اور ہندوستان ہی نے یہ نام اُسے دیا ہے۔ مشرق بعید کے خاموش گوشے گوتم بدھ کے منڈہون (Monas teries) سے معمور ہین جو آجتک ہندوستان کے تعلقات ماضی کی شاندار یاد اپنے اندر چھپائے ہوئے ہین۔ آج بھی وہان کے مقدس سادہو مغرب کے ملک "ٹین چاؤ" (ہندوستان) کی طرف جو کسی زمانہ مین فاہیان اور ہوین سانگ کے نزدیک فردوس برین سے کم نہ تہا سر نیاز خم کرتے ہین۔

مقام مسرت ہے کہ اس دور کے اہل علم حضرات مین ایک ایسا احساس پیدا ہو چلا ہے جو انہین اپنے بین الاقوامی تعلقات کو دوبارہ زندہ کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ ہم ہندوستانیون کے لئے یہ ایک نادر موقعہ ہے۔ ہمین چاہئے کہ یہین تک پہونچکر خاموش نہ ہو جائین بلکہ یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کرین کہ ہمارے آباواجداد نے ان سے گہرے تعلقات قایم کرنے مین کہان تک کامیابی حاصل کرلی تہی۔ اسطرح ہمارے اور ان کے درمیان ایک بار پہر مضبوط رشتۂ اخوت قایم ہو جائیگا۔

تیسری صدی قبل مسیح کے وسط تک چین نو سردارون کی حکومت مین تقسیم تہا۔ "چسو" کی مرکزی

حکومت موجود تہی - مگر برائے نام - حکومت ٹسین کے سردار "شانگ سیانگ" نے بعض چھوٹی حکومتوں کو شکست دیکر اتنی قوت پیدا کرلی کہ مرکزی حکومت کا مقابلہ کرسکے - اپنی تین سال کی مدت حکومت مین وہ ان شاہزادون اور سردارون سے برابر لڑتا رہا جو اسکی حکومت کے تسلیم کرنے مین پس و پیش کررہے تہے - یہ جنگ اُس کے عاقل و فرزانہ بیٹے "شنگ" نے نہایت کامیابی سے جاری رکھی - اس نے نہایت سرگرمی سے طوائف الملوکی کا خاتمہ کرکے حکومت چین اور اس کے قومی اتحاد کی بناڈالی - اور اس نے "شی ہانگ ٹی" یا شہنشاہ اول کا لقب اختیار کیا - لیکن اس تنظیم اور اتحاد کا کام جو اس نے شروع کیا تہا اُسکی زندگی مین اختتام پذیر نہ ہوسکا - چنانچہ "ہن" (Han) خاندان کے حکمرانون نے جو "ٹسین" (Tsin) خاندان کے بعد برسراقتدار ہوئے اس کام کو جاری رکھا - لیکن اس نئے خاندان نے طریق کار مین "ہن" خاندان سے اختلاف کیا "شہنشاہ اول" نے طوائف الملوکی اور امارت کا خاتمہ کردیا تہا - لیکن "ہن" خاندان کے حکمرانون نے ایک نئی تہذیب کی بناڈالی جس سے قوت دولت مندون کے ہاتہہ سے نکلکر عقلمندون کے ہاتہہ مین چلی گئی -

خاندان "ہن" مین "شاہ "او" (Wu) کا دور حکومت (۱۴۰ ق-م سے ۱۸۰ ق-م تک) امور خارجہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے اُس نے دوسرے ممالک سے تعلقات قایم کئے - اور بین الاقوامی فضا پہلے پہل قایم کی اور یہی وہ زمانہ ہے جب چین کو ہندوستان سے سابقہ پڑا - ۱۳۵ ق-م مین چین کے قدیم دشمن "ہیانگ نس" خاندان کے خطرہ کی وجہ سے اسے اپنی پوزیشن کے مضبوط کرنے کی فکر ہوئی - اس لئے "شاہ اوتی" (Wu Ti) نے ایک شخص "شانگ کین" نامی کو اپنے مددگار پیدا کرنے کے لیے حکومت یوچی (Yueh Chi) مین بہیجا جو اسوقت آکسس (Oxus) کی شمال مغربی وادی پر قابض تہے - "شیانگ کین" ۱۲۶ ق-م - مین چین کو ۱۲ سال کی غیر حاضری کے بعد واپس گیا - اگرچہ وہ اپنے مقصد مین ناکام رہا - مگر چین کا تعارف ایک نئی دنیا سے کرانے مین وہ بہت مفید ثابت ہوا - اوس نے "شاہ اوتی" (Wu Ti) کو جو رپورٹ دی اس مین مختلف ریاستون مثلاً فرغانہ - پارتہیا - بلخ وغیرہ کا ذکر تہا - اس نے ملک بلخ کے باشندون سے سنا کہ وہان قریب ہی ایک دولت مند اور مضبوط حکومت شین آذ

یعنی ہندوستان) ہی ہے۔

اس کے بعد سے شاہ "اودی" (Wu Ti) کی توجہات دوطرف ہوگئین۔ ایک طرف تو وہ اپنے غنیم "ہیانگ نس" خاندان کی حکومت پر قابض ہونا چاہتا تہا اور دوسری طرف وہ ہندوستان سے سلسلۂ آمد و رفت قایم کرنا چاہتا تہا۔ چنانچہ وہ ۱۱۵ھ ق-م مین اپنے پہلے مقصد مین کامیاب ہوگیا۔

اب سلطنت چین سے ممالک غیر مین سفرا بہیجے جانے لگے۔ اور حکومت فرغانہ سے نہایت دوستانہ تعلقات قایم ہوگئے۔ کہ یہان کے گھوڑے نہایت عمدہ ہوتے تہے۔ یہ دوستانہ تعلقات ۱۰۲ق م تک بدستور قایم رہے کہ ایک نزاع پیدا ہوگئی۔ چین سے افوج بہیجی گئین۔ اور انہون نے جاکر فرغانہ پر قبضہ کرلیا۔ فرغانہ کے لوگون نے ان کی حکومت تسلیم کی اور خراج دینے کا وعدہ کیا۔

مشرقی ترکستان کے راستہ پر قابض رہنے کی چینیون نے پہلی صدی عیسوی مین کوشش شروع کی۔ اور سولہ سال کی متواتر جنگ کے بعد مملکت تارم کے بعض حصون پر قابض ہوگئے ۹۱ء مین اس حصۂ ملک کے لئے "کوچہ" (Kucha) پایۂ تخت قرار پایا۔ اور چینیون نے مغربی دنیا سے تعلقات شروع کردئے۔ لیکن اس سے بہت پہلے چین اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات قایم ہوچکے تہے ہمارے پاس اس ثبوت کے لئے کافی سامان موجود ہین کہ دوسری صدی عیسوی مین ہندوستان اور چین کے درمیان اچھا خاصہ ربط پیدا ہوگیا تہا۔ اس صدی کے چینی مصنفین کی کتابون مین ہندوستان کے اکثر قصون اور کہانیون کا ذکر ملتا ہے۔

اس زمانہ کے بعد سے ان دونون ممالک مین ربط وضبط برابر بڑہتا گیا یہانتک کہ بدھ مذہب نے اس رشتہ کو اور زیادہ زوردار کردیا۔

جستجوئے وفا

(از محمد صدیق صاحب تسلیم مالیگانوی)

کیا سوال یہ "بھونرے" سے ایک دن مین نے
که بات کیا ہے یہ تیری سرشت ہستی مین

کبھی دکھائی دیا شاخ گل کے گرد اگرد
کبھی چمن کی بلندی مین اور پستی مین

ہے اس کلی سے کبھی عشق اُس کلی سے کبھی
عجیب حال ہے تیرا گلون کی بستی مین

ملا کسی کے "گلے" کی کسی سے سرگوشی
کسی کو چوم لیا تو نے جوش مستی مین

کسی پر اپنے ترنم سے وہ کیا جادو
که فرق بھول گئی نیستی و ہستی مین

وہ کون ہے؟ ہوا جس سے تیرا یارانہ
مگر کسی کو جگہ دی نہ دل کی بستی مین

مزا تو جب ہے کسی ایک پر فدا ہو جا
گنوا نہ اپنی جوانی ہوس پرستی مین

ملا جواب! کہ نادان تو سمجھ نہ سکا
نہان ہے راز جو اس میری گل پرستی مین

ہے میری سب تگ و دو ایک جستجوئے طویل
خدا نے کی ہے ودیعت جو میری ہستی مین

ہے منتہائے نظر میرا رنگ و بوئے وفا
اسی کو ڈھونڈتا ہون مین چمن کی بستی مین

مگر نہ پوچھ اے تسلیم نیتجۂ کوشش
"ہزاردون لالہ و گل ہین ریاض ہستی مین"

وفا کی جس مین ہو بو وہ کلی نہین ملتی

رموزدل

از جناب تسنیم - جہان آبادی

برون زخواب شو و آسمان را بنگر نور
ستارہ ہائے درخشان فسانہا دارند

تبسم ناہید قرۃ العین است
ظلام و نور پریشان رموزہا دارند

انسان کا پنجر

(از جناب الحاج خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی اعزازی مبلغ اسلام و مترجم فلسفۂ تعلیم ہربرٹ اسپنسر)

تو ہیچ بُدی کہ جسم و جانت دادند
بر کسب و عمل تاب و توانت دادند
از دادہ و نادادہ۔ شکایت چہ کنی
کان چیز کہ ہست۔ رائگانت دادند (نظیری)

۱- بدن کی ہڈیاں اور ان کی سختی

بچو! تم کو کھیل میں کسی لڑکے کے ہاتھ۔ پاؤں، کہنی، یا گھٹنے وغیرہ کا دھکا کبھی نہ کبھی ضرور لگا ہوگا۔ اور شاید ایسا ہی ہوا ہو کہ کسی نے قصداً ایک مکّا لگایا اور تم کو اس سے تکلیف ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدن کے اندر کوئی ایسی سخت چیز ہے۔ جس کے دھکے سے ہم کو تکلیف پہونچتی ہے۔ جانتے ہو کہ یہ سخت چیز کیا ہے؟ ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ ہڈیاں ہیں۔ بعض ہڈیاں تو کھال کے نیچے ہی ہوتی ہیں۔ جیسے انگلیوں کے جوڑ۔ جن کو بڑی آسانی سے ٹٹول سکتے ہیں۔ اور بعض ہڈیوں کے اوپر گوشت چڑھا ہوا ہے جیسے ران کی ہڈی۔ اور ٹٹولنے سے بس اتنا ہی پتہ لگتا ہے کہ اندر کوئی سخت چیز ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسکی شکل کیسی ہے؟ کیونکہ وہ گوشت کے اندر چھپی ہوئی ہے۔

۲- بازو کی ہڈیاں

شاید تمہیں کبھی ایسا خیال نہ آیا ہوگا کہ اپنے بدن کی ہڈیوں کو شمار کرو اچھا- ذرا اپنے بازو کو دیکھو تم کو اس کے تین حصے نظر آئینگے۔

(۱) اوپر کا حصہ .... کندھے سے کہنی تک۔

(۲) بیچ کا حصہ .... کہنی سے کلائی تک

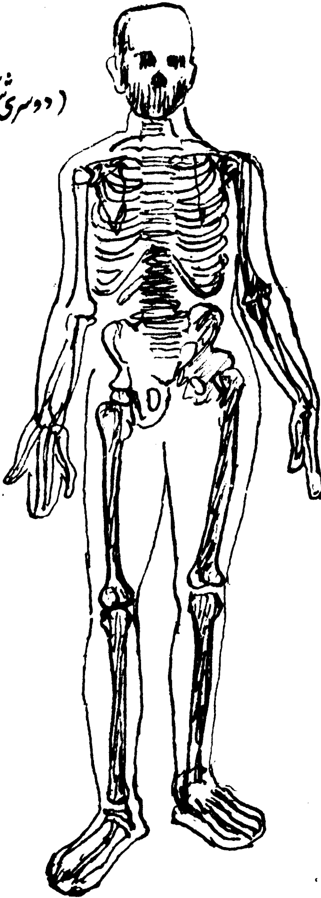
(۳) نیچے کا حصہ .... (یعنی پنجہ) جس میں کلائی۔ ہتھیلی اور انگلیاں ہیں

اوپر کے حصہ مین ایک موٹی سی ہڈی صاف معلوم ہوتی ہے۔ بیچ کا حصّہ دو ہڈیون سے ملکر بنا ہے۔ تم چاہو تو ان کو ٹٹول کر دیکھ سکتے ہو۔ پنجہ مین بہت سی ہڈیان ہین۔ جنکی تفصیل یہ ہے۔
کلائی مین آٹھ ۸ ہڈیان۔ گر وہ اس قدر پاس پاس ہین کہ تم اُن کو گن نہین سکتے۔ اس کے بعد ہتھیلی کی پانچ ۵ ہڈیان ہین جو الگ الگ معلوم ہو سکتی ہین۔ پھر چار انگلیان ہین اور ایک انگوٹھا چارون انگلیون کی بارہ ۱۲۔ اور انگوٹھے کی دو ۲ ہڈیان بھی صاف صاف نظر آتی ہین۔ اب ان سب کو گن کر دیکھو تیس ۳۰ ہڈیان ہوتی ہین۔ اوپر کے حصے مین ایک بیچ کے حصہ مین دو۔ اور نیچے کے حصہ مین ستائیس۔ یعنی ہمارے ایک بازو مین کندھے سے لیکر انگلیون کے سرون تک کل تیس ۳۰ ہڈیان ہین۔

۳۔ ہاتھ کی ہڈیون کی تصویر

ابھی بہت مدت نہین گذری کہ ایک آلہ ایسا ایجاد ہوا ہے۔ جس سے انسان یا حیوان کے بدن پر ایک قسم کی روشنی یعنی کرنون کا عکس ڈالتے ہین۔ (ان کرنون کو انگریزی مین "ایکس ریز" کہتے ہین) اس عکس کا یہ اثر ہے کہ انسانی پنجر یعنی ہڈیون کے ڈھانچے کی تصویر تو صاف اُتر آتی ہے۔ مگر بدن کے باقی حصون گوشت پوست وغیرہ کی تصویر نہین اُترتی۔ اگر ہمارے ہاتھ پر اس روشنی کا عکس ڈالا جائے۔ تو اُس کی ہڈیون کی تصویر ایسی نظر آئے گی۔ جیسی ہم نے دکھائی ہے۔ (دیکھو پہلی شکل)


(پہلی شکل)



(دوسری شکل)

۴- بدن کی ہڈیون کی تعداد جب ایک بازو مین تیس[۳۰] ہڈیان ہین تو دونون بازوؤن مین مل کر ساٹھ[۶۰] ہڈیان ہوئین۔ اگر اسی طرح بدن کی ہڈیون کو شمار کرنے چلے جائین تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ان کی تعداد دوسو[۲۰۰] ہے۔ مین سمجھتا ہون آج سے پہلے کبھی تم کو ایسا خیال نہ آیا ہوگا کہ ہمارے بدن مین دوسو ہڈیان ہین انسانی پنجر کی اس تصویر مین ان سب ہڈیون کو تم دیکھ سکتے ہو۔ (دیکھو دوسری شکل)

۵- ہڈیون کے فائدے شاید تم سوال کرو کہ بدن کے اندر اتنی ہڈیون کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ایک دو ہڈیان کافی نہین تہین؟ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ ان ہڈیون سے بڑے بڑے کام نکلتے ہین۔ اب مین تم کو ہڈیون کے کچھ فائدے سمجھاتا ہون۔

۶- پہلا فائدہ۔ ہڈیان بدن کی بنیاد ہین ہڈیان ہمارے بدن کا ڈھانچا یا بنیاد ہین۔ بدن کی تمام عمارت ہڈیون کے اوپر قایم ہے۔ جن سے بدن مضبوط رہتا ہے۔ جب ہم کوئی بڑا مکان بنانا چاہتے ہین۔ تو بہت سے دروازے اور کہڑکیان رکھتے ہین اور ان کے لئے چوکھٹین تیار کرتے ہین۔ چوکھٹون کو زمین پر قایم کرکے اُن کے اردگرد اینٹین یا پتھر کے ٹکڑے لگاتے ہین۔ اس سے مکان مضبوط رہتا ہے۔ اسی طرح ہڈیون کے چارون طرف گوشت کے ٹکڑے لگائے گئے ہین۔ اور ہڈیان انکو سہارا دیتی ہین۔ یہ ہڈیون کا پہلا فائدہ ہے۔

۷- دوسرا فائدہ۔ ہڈیان اعضا کی حرکت کا باعث ہین بچے کبھی کبھی زمین مین

ایک لکڑی گاڑ کر گیلی مٹی اُس کے چارون طرف تھوپ دیتے ہین۔ لکڑی بالکل چھپ جاتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کھڑا ہے۔ اگر انسان کا بدن بھی اسی طرح ایک ہڈی کا بنا ہوا ہوتا اور اس کے گرد گوشت منڈھ دیا جاتا تو جس کام کے لئے بدن بنایا گیا ہے وہ کام نہ نکلتا۔ یعنی ہم اپنے بدن کے کسی عضو کو حرکت نہ دے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے بدن مین بہت سی ہڈیان بنائین۔ اور بڑی حکمت سے اُن کو ملا کر اپنی اپنی جگہ پر رکھا ہے اب ہم بدن کے جس حصہ کو جب چاہین اور جس طرف چاہین بہت آسانی سے حرکت دے سکتے ہین۔ اور خوبی یہ ہے کہ اس بار بار کی حرکت سے ہمارے اعضار کمزور نہین ہوتے۔ بلکہ اور زیادہ مضبوط ہوتے جاتے ہین یہ ہڈیون کا دوسرا فائدہ ہے،

۸۔ تیسرا فائدہ۔ ہڈیان محافظ اعضا ہین

ہڈیان ہمارے بدن کے بعض حصون کی حفاظت کرتی ہین۔ ہڈیان نہ ہوتین تو بدن کے نازک حصون (آنکھ، کان وغیرہ) کو تھوڑی سی چوٹ سے بہت نقصان پہنچ جاتا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے بیکار ہوجاتے اور ہماری زندگی دشوار ہو جاتی۔ یہ ہڈیون کا تیسرا فائدہ ہے۔

۹۔ حفاظت اعضار کی مثالین

پہلی مثال (کان کی حفاظت)

اب مین بتاتا ہون کہ ہڈیان کس طرح اعضار کی حفاظت کرتی ہین۔ یہ بات اگلی مثالون سے تمہاری سمجھ مین آجائے گی۔

(۱) کان ہمارے بدن کا بہت ہی ضروری حصہ ہے۔ مگر اس قدر نازک کہ اگر ذرا سا صدمہ پہونچے تو بالکل بیکار ہوجائے۔ سننے کی طاقت جاتی ہے اور آدمی بہرا ہوجائے۔ اسی لئے خدا نے اس کو ایک مضبوط ہڈی کے اندر بند کرکے بڑی حفاظت سے رکھا ہے۔

۱۰۔ دوسری مثال (آنکھ کی حفاظت)

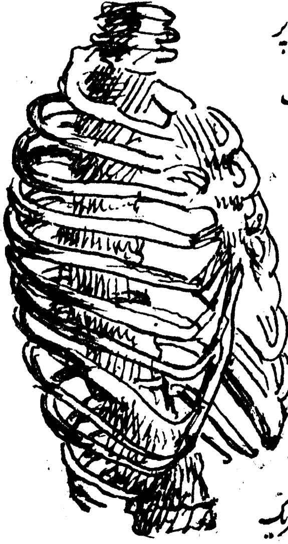
آنکھ بھی ایسا ہی ضروری اور نازک عضو ہے۔ آنکھین نہ ہون تو زندگی کا کچھ لطف نہین۔ خدا نے دونون آنکھون کو سخت ہڈی کے دو پیالیون مین رکھا ہے۔ اور اُن کا صرف تھوڑا سا اگلا حصہ کھلا رہتا ہے۔ باقی کل حصہ چھپا رہتا ہے۔ کھلے حصہ کی حفاظت کے لئے بھی پردے لگا دئے ہین۔ جن کو پپوٹے کہتے ہین جب کوئی ایسی چیز جس سے آنکھون کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ آنکھون کے پاس آتی ہے

تو پپوٹے فوراً آپ سے آپ بند ہو جاتے ہین۔ یہ آنکھون کی حفاظت کا قدرتی انتظام ہے۔

۱۱۔ تیسری اور چوتھی مثال پھیپھڑون اور "دل" کی حفاظت

(۳) و (۴) پھیپھڑے۔ جن سے ہم سانس لیتے ہین بدن کے نہایت ضروری حصّے ہین۔ اگر ان کو صدمہ پہونچے تو سانس رک جائے اور دم نکل جائے۔ دل بھی جس سے بدن کے تمام حصون کو خون پہونچتا ہے ایسا ہی ضروری عضو ہے۔ اگر دل کو صدمہ پہونچے۔ اور اسکی حرکت بند ہو جائے تو بھی آدمی کا کام تمام ہو جائے۔ اسی وجہ سے خدا نے دل اور پھیپھڑون کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط پنجرہ بنایا ہے۔ اور بڑی حکمت سے اُن کو اس کے اندر رکھ دیا ہے۔ یہ پنجرہ پسلیون کی ہڈیون کا بنا ہوا ہے

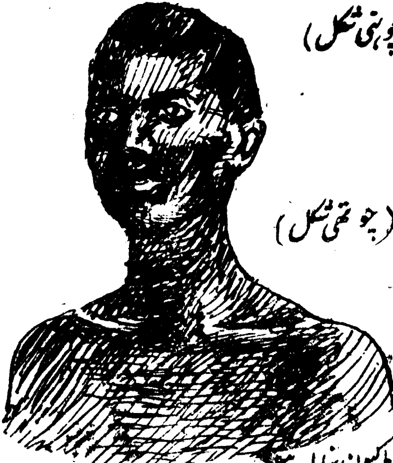
۱۲۔ پانچوین مثال دماغ کی حفاظت



(۵) تم کبھی کسی جوہری کی دکان پر گئے ہو؟ اور اسکو شام کے وقت دوکان بند کرتے دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو بتاؤ وہ اُسوقت کیا کرتا ہے؟ شاید تمکو معلوم نہ ہو مین بتاتا ہون وہ اپنے قیمتی جواہرات ایک مضبوط لوہے کے صندوق مین بند کر کے بہت حفاظت سے رکھتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ رات کے وقت کوئی چوہا نکل کر کسی جواہر کو بل مین لے گھسے۔ یا چور چرا کر لے جائے۔ ہمارے بدن کا ایک عضو جواہر سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ کیونکہ وہ بدن کا حاکم ہے۔ بدن کے ہر ایک حصّہ پر اُس کی حکومت ہے۔ تم سمجھے یہ کونسا حصہ ہے؟ یہ دماغ ہے جسکو مغز یا بھیجا کہتے ہین۔ کسی بات کا سوچنا یا سمجھنا دماغ کا کام ہے۔ اور دماغ سے بدن کے تمام حصون کو دن رات تار برقی کی سی خبرین برابر پہونچتی رہتی ہین۔

دماغ ایسی نازک چیز ہے کہ اس کے ذرا سے صدمہ سے بڑا نقصان پہونچ جاتا ہے۔ یہانتک کہ آدمی کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ ایسے نازک اور قیمتی جواہر کی حفاظت کے لئے پورے بندوبست کی ضرورت

تھی۔ اس لئے خدا نے ایک مضبوط صندوق مین جو بہت ہی سخت ہڈی کا بنا ہوا ہے۔ اسکو محفوظ رکھا ہے اس دماغی صندوق کو کھوپری کہتے ہین۔ (دیکھو چوتھی شکل)



(چوتھی شکل)

بچون کی صحت اور قوت کے لئے کھانے پینے کے علاوہ کھیلنے کودنے اور بھاگنے دوڑنے کی بھی ضرورت ہے۔ جس مین اکثر چوٹین بھی لگتی ہین۔ بہت ہی سخت چوٹ لگ جائے تو اس کا ذکر نہین۔ ورنہ معمولی چوٹون سے دماغ کو کوئی صدمہ نہین پہونچتا۔ کیونکہ وہ کھوپری کے اندر محفوظ ہے اب تم سمجھہ سکتے ہو کہ خدا نے کھوپری کو اسقدر مضبوط کیون بنایا ہے

۱۳۔ چھٹی مثال (حرام مغز کی حفاظت)

(۶) تم نے کبھی پتنگ اُڑایا ہوگا۔ یا کسی کو اُڑاتے دیکھا ہوگا۔ کبھی کاغذ وغیرہ کا دُم چھلا بھی پتنگ کے ساتھ لگا ہوا دیکھا ہوگا۔ اسی قسم کا ایک دُم چھلا دماغ کے ساتھہ بھی لگا ہوا ہے۔ جو کمر کی نالی کے آر پار نیچے تک چلا گیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک پتلی رسی یا ڈوری۔ یا بتی رکھی ہوئی ہے۔ اس کو حرام مغز کہتے ہین۔ دماغ کی طرح یہ بھی ایک نرم مادہ ہے۔ اور اسکی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔ (دیکھو پانچوین شکل)

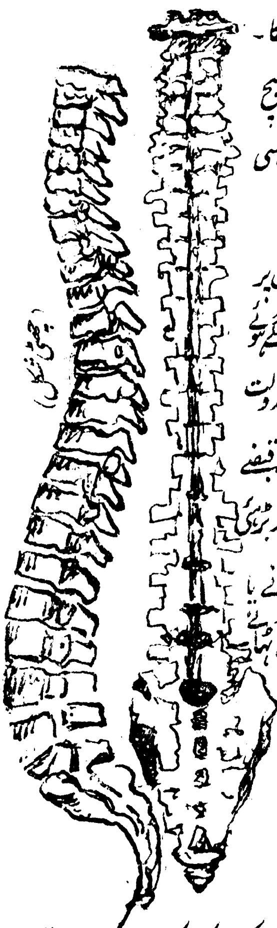


(پانچوین شکل)

کمر کی بیچ کی ہڈی کو ریڑھ کہتے ہین یہ ایک ہڈی نہین ہے بلکہ چھبیس ۲۶ ہڈیون کا ایک ستون ہے۔ جن کو ریڑھ کے مُہرے کہتے ہین۔ ان ہی مہرون سے ریڑھ مین لچک پیدا ہو گئی ہے اور اسی لئے ہم جس طرف چاہین اپنی کمر کو جھکا سکتے ہین۔ اگر ریڑھ ایک ہی ہڈی کی بنی ہوئی ہوتی تو جینا پھرنا تو الگ رہا۔ خود زندگی

وبال ہو جاتی۔

مُہرون کے بیچ بین تسبیح کے دانون کی طرح آر پار سوراخ ہوتے ہین۔ یہ مُہرے تلے اوپر اس طرح رکھے گئے ہین کہ ایک لمبی نالی سی بن گئی ہے۔ اسی نالی کے اندر حرام مغز رہتا ہے۔ جس طرح ڈورے مین تسبیح کے دانے یا منکے پروئے جاتے ہین۔ اسی طرح ریڑھ کے مہرے۔ حرام مغز کی ڈوری مین پروئے ہوئے ہین۔ اگر ایک ڈورے مین منکے اس طرح پرودئے جائین کہ ایک منکے کی جگہ بہی خالی نہ رہے تو ڈورا منکون کے اندر چھپ جائے گا۔ اور نظر نہ آئیگا۔



حرام مغز کی ڈوری بہی اسی لئے نظر نہین آتی کہ وہ چھبیس (۲۶) مہرون کے بیچ مین چھپی رہتی ہے۔ اب تم نے سمجھا کہ ریڑھ کی ہڈی سے حرام مغز کی کیسی حفاظت ہوتی ہے۔ (دیکھو چھٹی شکل)

۱۴۔ ہڈیون کے جوڑ اور اُن کی حرکت

ذرا اپنے مکان کے دروازون اور کھڑکیون پر ایک نظر ڈالو۔ اور کواڑون مین جو قبضے لگے ہوئے ہین۔ ان کو غور سے دیکھو ان ہی قبضون کی بدولت کواڑ بہت آسانی سے کُھل سکتے ہین اور بند ہو سکتے ہین۔ اگر کُل مکان کے قبضے شمار کرو تو اُن کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ اگر قبضے نہ لگائے جائین اور بڑے قبضون کے بغیر ہی چوکھٹ مین کواڑ لگا دے تو ہم کو دروازہ کے بند کرنے یا کھولنے کے وقت ہمیشہ ایک آدمی کی ضرورت ہوگی۔ جو کواڑون کے اُٹھانے یا سرکانے مین مدد دے۔ اور یہ ہر وقت کی دقت اور مصیبت ہے مگر قبضون کی وجہ سے ایک چھوٹا بچہ بہی بڑی آسانی سے دروازہ بند کر سکتا ہے اور کھول سکتا ہے۔

ہمارے بدن مین بہی کچھ اسی قسم کا انتظام ہے۔ بدن مین جہان کہین اس بات کی ضرورت تہی کہ دو ہڈیان ایک دوسرے کے اوپر حرکت کر سکین وہین خدا نے

ایک قبضہ یعنی جوڑ لگا دیا ہے۔ اور ہڈیون کو بہت پاس پاس رکھا ہے۔ اور جہان دو ہڈیان ملتی ہین وہان ان کی سطح کو ایسا خوبصورت۔ صاف اور چکنا بنایا ہے کہ چمکدار چینی کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہین۔ اس کے علاوہ ہڈیون کو مضبوط بندھنون یا پٹھون سے جن کو نسین کہتے ہین۔ خوب کس کر باندھا ہے۔ یہ نسین بہت آسانی سے مڑ سکتی اور جھک سکتی ہین۔ مگر جب تک بہت زیادہ زور نہ لگایا جائے اُسوقت تک نہ کھچ سکتی ہین نہ اپنی جگہ سے اُکھڑ سکتی ہین۔

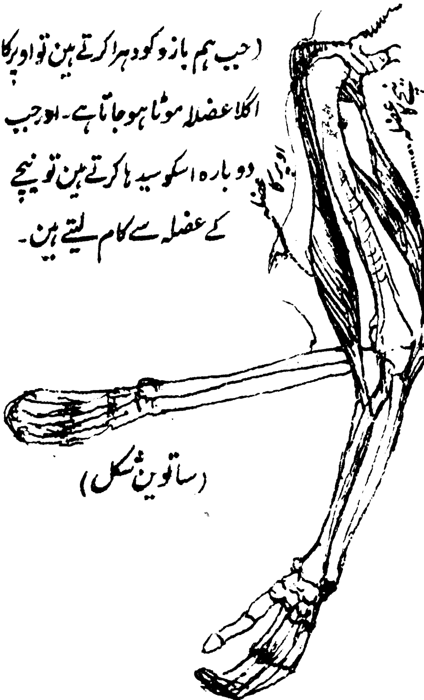
۱۵۔ چکنائی کی تھیلی کبھی کبھی دروازون کو بند کرتے یا کھولتے وقت قبضون سے ایسی آواز نکلتی ہے جو کانون کو بُری لگتی ہے۔ یہ کچھ ایسی آواز ہوتی ہے جیسی دو پتھرون کو باہم رگڑنے یا سلیٹ کے قلم سے زور دے کر سلیٹ پر لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی حالت مین قبضون کے اوپر تھوڑا سا تیل یا چکنائی لگا دیتے ہین۔ تو وہ ناگوار آواز بند ہو جاتی ہے۔ مگر بدن کے قبضون یا جوڑون سے اس قسم کی چون چون کی آواز نکلتی کبھی نہین سنی جاتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بدن کے ہر ایک جوڑ مین چکنائی کی چھوٹی سی تھیلی رکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے جوڑ چکنا رہتا ہے اور اسکی حرکت سے کوئی آواز نہین نکلتی۔

۱۶۔ عضلات کیا ہین؟ اب اس بات پر غور کرو کہ وہ کیا چیز ہے جو ہڈیون کو حرکت دیتی ہے۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ ہڈیون کے اوپر گوشت چڑھا ہوا ہے۔ اب یہ سمجھ لو کہ جس کو ہم گوشت کہتے ہین۔ وہ اصل مین عضلہ ہے۔ عضلہ ایک عربی لفظ "عضل" سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہین "چوہا"۔ گوشت کے لوتھڑون کو چوہے سے مثال دینا یا تو اسوجہ سے ہے کہ اُن کی شکل کچھ کچھ چوہے سے ملتی جلتی ہے۔ یا شاید یہ سبب ہو کہ وہ ہمیشہ اس طرح ملتے رہتے ہین جس طرح چوہا اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا ہے۔ گوشت کے ایک لوتھڑے یا ٹکڑے کو عضلہ اور بہت سے لوتھڑونکو یا ٹکڑون کو عضلات کہتے ہین۔

۱۷۔ عضلات اور ہڈیون کی حرکت عضلات ہمیشہ گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہین۔ یعنی کھنچنے سے لمبے اور پتلے اور سکڑنے سے چھوٹے اور موٹے ہو جاتے ہین۔ اس کا سبب کیا ہے؟

مین تم کو بتاتا ہون۔ عضلہ کے دونون سرے ہڈیون سے بندہے رہتے ہین۔ ذرا اپنے بازو کے اوپر کے عضلہ پر ایک نظر ڈالو۔ اُس کا ایک سرا کندھے کے ساتھ جڑا ہوا۔ اور دوسرا سرا بازو کی ایک ہڈی سے بندھا ہوا ہے۔ اب بازو کے نیچے کے حصّہ کو موڑ کر اوپر کے حصہ پر رکھو۔ اور اوپر کے عضلہ کی شکل کو غور سے دیکھو تو وہ موٹا معلوم ہوگا۔ کیونکہ سُکڑ کر چھوٹا ہوگیا ہے۔ اُس کا اوپر کا سرا تو قایم ہے۔ اور کندھے کی ہڈی سے اس طرح بندھا ہوا ہے کہ اپنی جگہ سے ہل نہین سکتا۔ رہا نیچے کا سرا وہ بیشک حرکت کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عضلہ سکڑتا ہے تو اُس کا نیچے کا سرا اوپر آجاتا ہے۔ مگر یہ سرا بازو کی دوسری ہڈی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اسی لئے جب عضلہ سکڑتا ہے تو ہڈی کو (ہاتھ سمیت) اوپر کھینچ لاتا ہے۔

(دیکھو ساتوین شکل)



(جب ہم بازو کو دوہرا کرتے ہین تو اوپر کا اگلا عضلہ موٹا ہوجاتا ہے۔ اور جب دوبارہ اسکو سیدھا کرتے ہین تو نیچے کے عضلہ سے کام لیتے ہین۔

(ساتوین شکل)

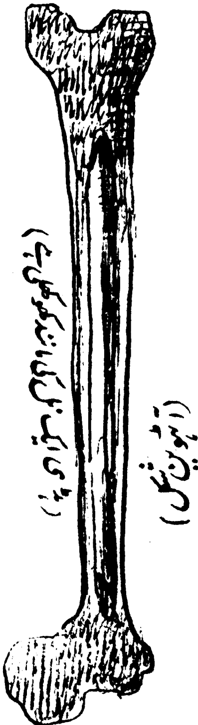
۱۸۔ ایک ہڈی کی حرکت کے لئے دو عضلات

اچھا۔ اب بازو کو دوبارہ اوپر سے نیچے کی طرف جھکاؤ۔ اور دیکھو کیا ہوتا ہے؟ کیا بازو فوراً ہی نیچے گر پڑتا ہے؟ نہین یہ بات نہین ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بازو کو سخت صدمہ پہونچتا بلکہ بازو کو اوپر لے جانا اور پھر نیچے لانا ہمارے اختیار مین رکھا گیا ہے کہ ہم اسکو جلدی یا آہستہ جس طرح چاہین حرکت دین اور بعض اوقات بازوؤنکو بہت ہی جلد جلد گھمانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لئے خدا تعالےٰ نے بازو کے پیچھے کی طرف ایک اور عضلہ لگا دیا ہے۔ جو اسکو نیچے

کھینچتا ہے۔ تمام بدن مین قریب قریب ہر جگہ ایسا ہی انتظام ہے کہ جب ایک عضلہ کسی ہڈی کو ایک طرف کھینچتا ہے۔ تو دوسرا عضلہ اسکو مقابل کی طرف کھینچ سکتا ہے

۱۹- کھوکھلی ہڈیونکی مضبوطی

کبھی کھیت یا جنگل مین سیر کے وقت تم نے کسی جانور کی ہڈیون کا ڈھانچا زمین پر پڑا دیکھا ہوگا۔ جب کوئی پرندہ یا جانور مرجاتا ہے تو اس کا گوشت وغیرہ گل سڑ کر فنا ہو جاتا ہے۔ یا کیڑے مکوڑے۔ چیل۔ کوے۔ وغیرہ اسکو کہا لیتے ہین۔ ہڈیان خشک ہوکر سخت ہو جاتی ہین۔ اور بالکل صاف نکل آتی ہین۔ اگر کبھی ایسی ہڈی ہاتھ لگے۔ تو اسکو غور سے دیکہنا۔ شاید کسی پرندے کی ٹانگ کی ہڈی مل جائے یہ بہت چھوٹی اور تمہاری انگلی کے برابر ہوگی۔ مگر اسقدر مضبوط کہ اُس کا توڑنا تمہارے لئے مشکل ہوگا۔ تم دیکھوگے کہ یہ ہڈی نلی کی طرح اندر سے کھوکھلی ہے۔ اگر کوئی بڑی ہڈی ہاتھ آجائے جیسے آدمی کی ران کی ہڈی۔ تو وہ اس قدر مضبوط ہوگی کہ تم اسکو توڑ نہ سکوگے۔ تم کو تعجب ہوگا کہ ہڈی اندر سے خالی ہے اور پھر بھی اسقدر مضبوط کہ ٹوٹ نہین سکتی۔ (دیکھو آٹھوین شکل)



(ہڈی ایک بیلن یا نل کی کھوکھلی ہے)

(آٹھوین شکل)

تم نے دیکھا ہوگا کہ اکثر لوہے کے ستون ہڈی کی طرح کھوکھلے ہوتے ہین۔ ریلوے اسٹیشنون کی چھتون کے نیچے کھوکھلے ہی ستون لگائے جاتے ہین۔ اور انجنیر فرمایش کرکے ایسے ہی ستون بنواتے ہین کیونکہ وہ جانتے ہین کہ کھوکھلا نل ٹھوس ستون سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اگر دونون ایک ہی مادہ کے بنے ہوے اور ہموزن ہون۔

۲۰- ہڈیون کی مضبوطی اور ہلکاپن

شاہ بلوط کا درخت ولایت مین بہت ہوتا ہے ہندوستان مین بھی اس کے جنگل ہین۔ یہ درخت بڑا اونچا اور شاندار ہوتا ہے جیسے بڑ کا درخت۔ مگر اُسکی لکڑی نہایت مضبوط ہوتی ہے۔ پہلے زمانہ مین

اسی لکڑی کے جہاز بناتے تھے۔ اگر ہمارے بدن کی ہڈیاں ایسی ہی لکڑی کی بنی ہوئی ہوتیں تو بے شک مضبوط ہوتیں۔ مگر اب وہ شاہ بلوط کی لکڑی سے دو چند مضبوط ہیں اور ایک مضبوط پتھر سے جو عمارت میں کام آتا ہے۔ اُن کی مضبوطی بائیس گنی ہے۔ اور باوجود اس مضبوطی کے اسقدر ہلکی ہیں کہ اگر ہمارا پنجر فولاد کا بنا ہوا ہوتا تو اُس کا وزن چوگنا ہوتا۔ اور اسی لئے چلنا پھرنا مشکل ہوجاتا۔

۲۱۔ ہڈی کا مادّہ

تم نے دیکھا کہ ہماری ہڈیاں سخت پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہڈی کا زیادہ حصہ ایک قسم کا پتھریلا مادہ ہے۔ جس کے ریزے سریش جیسی لیسدار چیز کے ذریعہ سے خوب چسپاں کئے گئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہڈی بہت مضبوط ہوگئی ہے۔ اگر ہڈی کو تیزاب میں کئی دن تک بھگوئے رکھیں تو اس کا پتھریلا حصہ تیزاب میں گھل جائیگا۔ (جس طرح شکر پانی میں گھل جاتی ہے)۔ اگر اس تیزاب کو پھینک دیں تو ہڈی کا لیسدار حصہ باقی رہ جائیگا جس کی شکل بالکل ایسی ہی ہوگی۔ جیسی اصلی ہڈی کی تھی۔ اتنا فرق ضرور ہوگا کہ ہڈی پہلے سخت تھی۔ اور اُس کا موڑنا اور توڑنا بہت مشکل تھا۔ مگر اب وہ ایسی نرم ہوگئی ہے کہ اُسکو لاسٹک یا ربڑ کی طرح بڑی آسانی سے جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔

۲۲۔ بچوں کی ہڈیاں لچکدار ہوتی ہیں

بچوں کی ہڈیوں میں پتھریلا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ اور وہ اسی وجہ سے نرم اور لچک دار ہوتی ہیں۔ مگر بڑے آدمیوں کی ہڈیوں میں یہ مادہ زیادہ ہوتا ہے اور اسی سبب سے اُن کی ہڈیاں کرکری ہوجاتی ہیں۔ اور صدمہ پہونچنے سے بآسانی ٹوٹ سکتی ہیں۔ بچوں کی ہڈیاں کیسی نرم ہوتی اسکی کیفیت اس حکایت سے معلوم ہوگی۔ جو ایک مصنف نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"میں ایک دن بازار میں جارہا تھا۔ ایک بڑی سی گاڑی جس میں دو بڑے گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ تیزی کے ساتھ بازار میں سے گذری اتفاق سے ایک چھوٹا بچہ گاڑی کے رستہ میں آگیا۔ گاڑیبان نے گھوڑوں کو روکا مگر اُنکے رکتے رکتے گاڑی کا پہیہ بچہ کے بازو کے اوپر پھر گیا۔ میں بچہ کی مدد کے لئے دوڑ کر گیا دل میں یہی خیال تھا کہ اُسکا بازو ٹوٹ گیا ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ بچہ کا بازو نہیں ٹوٹا۔ بچہ کی ہڈی اسقدر

نرم ہتی کہ پیہ کے پہر جانے سے کسی قدر خم کہا گئی۔ مگر ٹوٹی ہنین۔ اگر پتھریلا مادہ زیادہ ہوتا تو ضرور ٹوٹ جاتی"

۲۳۔ اونٹ کی پسلی اور اُس کی لچک

اونٹ کی پسلیان کمان کی طرح خم دار اور لچکدار ہوتی ہین۔ یہ جانور عرب مین بہت ہوتا ہے۔ عرب کے بچے اس کی پسلیون کی کمانین بناتے اور اُن سے تیر چلاتے ہین۔ جو بانس کی کمان کا کام دیتی ہین۔ اور اُن مین بانس کی سی لچک ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا نے بڑی حکمت سے ہڈی کے ذرون کو لیسدار مادہ کے ساتھ چسپان کیا ہے۔

۲۴۔ خون کی تیاری کا کارخانہ

تم کو یہ معلوم ہوا کہ اکثر ہڈیان کھوکھلی ہوتی ہین۔ اور شاید یہ بہی دیکہا ہو کہ اُن کے اندر ایک نرم نرم چیز بہری ہوئی ہوتی ہے۔ جس کو گودا کہتے ہین۔ مدتون لوگ حیران رہے۔ اور کچھ نہ سمجھے کہ یہ ملائم مادہ کیا ہے۔ مگر اب یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ ہڈیون کے بیچ مین جو جگہ خالی ہے۔ وہ خون کی تیاری کا ایک بڑا ضروری کارخانہ ہے۔ خون کا زیادہ حصہ اسی جگہ تیار ہوتا ہے۔ اور اسی خون کا ایک حصہ نرم نرم گودا بنجاتا ہے۔

۲۵۔ خلاصہ

ہڈیون کا حال جو کچھ مین نے اب تک بتایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱)..... ہمارے ایک بازو مین تیس[۳۰] ہڈیان اور کل بدن مین دوسو[۲۰۰] ہڈیان ہین

(۲)..... ہڈیون کے کئی فائدے ہین (الف) ہڈیان بدن کا ڈہانچہ ہین۔ جنکی وجہ سے بدن مضبوط رہتا ہے۔ (ب) ہڈیون سے اعضا مین حرکت پیدا ہوتی ہے۔ (ج) ہڈیان بدن کے نرم اور نازک اعضا کی محافظ ہین۔ جنکو ذرا سے صدمہ سے بہت سا نقصان پہونچسکتا ہے۔ جیسے کان۔ آنکھ۔ پہیپھڑے۔ دل۔ دماغ۔ حرام مغز وغیرہ۔

(۳)..... بدن مین جابجا ہڈیون کے جوڑ بنائے گئے ہین۔ جیسے مکان کے دروازون مین قبضے لگائے جاتے ہین۔ ہر ایک جوڑ مین چکنائی کی ایک تھیلی رکھی گئی ہے۔ یہ جوڑ ایسی حکمت سے ملاکر بنائے گئے ہین کہ بدن بڑی آسانی سے ہر طرف حرکت کرسکتا ہے۔ (۴)..... ہڈیون کے بیچ کی خالی جگہ (جہان گودا رہتا ہے) خون کی تیاری کا بڑا کارخانہ ہے۔

تجلیات منیر

(از منیر الہ آبادی)

قبل اسکے کہ اصلیت اغیار کی کچھ جانے لازم ہے یہ انسان کو آپ اپنے کو پہچانے

روشن ہے خداخانہ جس نور کے پرتو سے لاریب اسی جلوہ سے معمور ہیں بتخانے

یہ عقدۂ لاینحل۔ حل کر نہ سکا کوئی کیون شمع ہوئی ٹھنڈی کیون جلگئے پروانے

ہوش آیا تو کب آیا عقل آئی تو کب آئی جب جیت لیں سب شرطیں ناداں سے دانانے

آبادیاں رونق پر ہیں حسن کے جلووں سے اے عشق ترے دم سے آباد ہیں ویرانے

آنکھیں ہیں کیسکی یا رکھے ہیں چھلکنے کو صہبائے محبت سے لبریز دو پیمانے

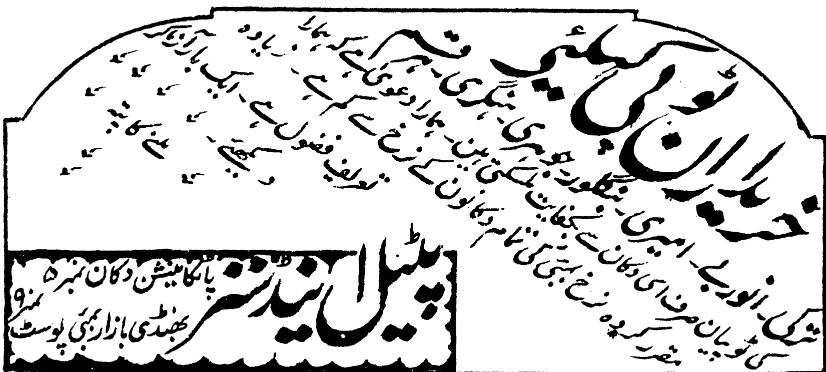
اے وہ کہ تری الفت ہے باعثِ رسوائی حسرت ہے کہ کہلائیں ہم بھی ترے دیوانے

ہر درد بھرے دل کی ہمدردی و شرکت پر مجبور کیا مجھکو دل درد شناسا نے

اک شرح مکمل ہے دیباچۂ ہستی کی کچھ قصے مصیبت کے کچھ درد کے افسانے

دل لوٹ ہوا دلبر آنکھوں سے ملیں آنکھیں شیشے سے ملا شیشہ پیمانوں سے پیمانے

جب وقت مصیبت کا انسان پہ منیر آیا
احباب و عزیز اپنے سب ہوگئے بیگانے



نازنین جاسوس

گذشتہ سے پیوستہ

(از مولانا فطرت انصاری - ندوی)

باب چہارم

کمرہ کے اندر

چارلس نے نہایت غور سے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ اندر ایک بہت بڑا دفتر ہے - جہان ٹیلیفون بھی لگا ہوا ہے - کمرہ کی ایک جانب لوہے کا بہت بڑا صندوق رکھا ہے - چارلس نے دیکھا کہ وہ نازنین اس کمرہ مین داخل ہوئی - اور اس صندوق کے دروازہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی - عورت کی پیٹھ چارلس کی طرف تھی - اس کی خاموشی اور غیر معمولی اطمینان سے چارلس اس نتیجہ پر پہونچا کہ ابھی اسکو چارلس کے خفیہ داخلہ کی خبر نہین ہوئی - اور اس وقت وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ کمرہ کی ہر چیز کی دیکھ بھال کر رہی ہے -

چارلس نے دیکھا کہ اس نازنین مجسمۂ اسرار عورت نے ٹوپی اُتار کر ایک طرف رکھدی ہے اور اپنی ساعد سیمین کو اس صندوق کی طرف بڑھا دیا ہے - چارلس نہایت خاموشی سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتا رہا - اتنے مین اُسے کسی اور شخص کی موجودگی کا علم ہو گیا - اور وہ فوراً جھجھک کر سکتہ مین آگئی - اور منہ پھیر کر دیکھا تو سامنے چارلس نظر آیا - چارلس پر نظر پڑتے ہی نازنین کا نازپرورده چہرہ فق ہو گیا - ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا - وہ نہایت خوف و ہراس سے اپنی بڑی بڑی آنکھین پھاڑ پھاڑ کر چارلس کی طرف دیکھنے لگی - مگر بالکل چپ تھی - اور اس کے لب سے

ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ ایک دیوار ہی کھڑی رہی۔ آخر اس کا خوف و ہراس کسی قدر کم ہوا تو وہ چارلس کی طرف بڑھی ———،

چارلس نے اسکی طرف دیکھا تو، مگر آنکھ سے آنکھ نہ ملا سکا۔ اُسے محسوس ہوا کہ حسب خواہش وہ اچانک پہونچ جانے مین کامیاب ہوا۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ شاید اس سے وہ نازنین دل مین بَیر رکھے۔ اور اس کا بدلہ لینے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ فوراً ذرا سا آگے بڑھی اور صندوق کی پچھلی سمت ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بٹن دبا دیا کمرہ فوراً تاریک ہوگیا اور چارلس حیران رہ گیا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ نازنین کے متعلق اب اس کا یہ شبہ زیادہ قوی ہوگیا کہ وہ اندھیرے مین اس سے بدلہ لینا چاہتی ہے ———، چارلس تھوڑی دیر تک تو اس تاریکی مین خاموش کھڑا رہا۔ آخر اُسے محسوس ہوا کہ نازنین نے اس بڑے صندوق کا قفل بند کر دیا ہے۔ اندھیرا تو تھا ہی۔ قفل کے بند ہونے کے بعد آہستہ آہستہ چلنے کی آواز بھی محسوس ہوئی۔ اور نازنین نے قفل کی کنجی کھڑکی کے راستہ باہر پھینک دی۔ یہ کارروائی اُس نے نہایت گھبراہٹ اور تیزی کے ساتھ کی۔ چارلس کو جب معلوم ہوا کہ کنجی باہر پھینکی جا چکی ہے تو وہ اپنی دبر اور سستی پر ہاتھ ملنے لگا۔ مگر بے سود۔ الغرض چارلس اس غلطی کی ندامت اور موقعہ کے ہاتھ سے نکل جانے سے ایک قالب بے جان ہوگیا۔ لیکن پھر دل کو سنبھالا اور تحکمانہ انداز سے، نازنین سے مخاطب ہوا ———،

"چارلس:۔ مین اُمید کرتا ہون کہ آپ روشنی کھول دینگی۔!

نازنین نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور بالکل بےحس و حرکت خاموش کھڑی رہی۔

چارلس:۔ روشنی کرو ورنہ پستول سے فائر کر دونگا۔ اور اس کمرہ کے تمام سامان کو اُٹھا کر باہر پھینک دونگا ———"!

چارلس کے پاس پستول وغیرہ تو اللہ کا نام تھا۔ یہ کہکر اس نے اپنی جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا۔ سگریٹ کیس چاندی کا تھا۔ اندھیرا تو تھا ہی۔ اس نے سگریٹ کیس کو کھولا اور فوراً بند کر دیا۔ کیس کے بند ہونے کی آواز نے نازنین کو پستول کا یقین دلا دیا۔ اور وہ گھبرائی کہ اب فائر ہوا۔ چنانچہ اس نے

فوراً بٹن دبادیا۔ اور کمرہ روشن ہوگیا۔ چارلس نے دیکھا کہ وہ حسب دستور صندوق کے سامنے خاموش کھڑی ہے۔ اسکی نظروں سے چارلس کو غصہ وغضب کے آثار تو ضرور معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ابھی اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا.............،

چارلس..........:۔ کھڑی کیوں ہیں۔ تشریف رکھئے نہ؟

نازنین.........:۔ آپ کا شکریہ میرے لئے کھڑا رہنا ہی بہتر ہے.........،

عورت کے لب ولہجہ سے چارلس اس نتیجہ پر پہونچا کہ وہ انگریزی صاف نہیں بول سکتی۔ اور ہو نہ ہو یہ جرمنی یا پولینڈ کی رہنے والی ہے۔.........،

چارلس..........:۔ آخر آپ کب تک کھڑی رہینگی؟ آپ کو بہت عرصہ تک کھڑا رہنا پڑے گا!

نازنین.........:۔ اور آپ؟

چارلس..........:۔ میں بس اسوقت تک یہاں ہوں۔ جب تک اس صندوق کا قفل نہیں کھلتا۔.....،

نازنین.........:۔ اسوقت تک آپ کھڑے رہینگے؟

چارلس..........:۔ ہاں میں اسوقت تک برابر کھڑا رہوں گا۔

نازنین.........:۔ اچھا تو میں آپ ہی کے کہنے پر بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔ واقعی اس کے لئے کافی عرصہ لگیگا۔

یہ کہہ کر نازنین پاس ہی کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ چارلس اسکی طرف دیکھ رہا تھا......... برقی روشنی نے نازنین کے خورشید جمال چہرہ کی قدرتی خوبیوں اور رنگ کے نکھار کو اچھی طرح واضح کردیا۔ اور چارلس آ: آسانی کے ساتھ اس کے عارض گلگوں۔ لمبی لمبی زنجیر نما سیاہ سیاہ زلفوں۔ مست ناز' نرگس نما آنکھوں رشک سرو' قد وقامت' بدن کی دلفریب ساخت' اور اس کے خط وخال کی نظر فریبی سے محظوظ ہونے لگا۔ اور اس تو بہ شکن حسن سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اپنے کام اور نازک پوزیشن کے خیال کو بھی بھول گیا۔

ایک عرصہ تک تو چارلس اس نازنین کی بہار حسن کے مزے لوٹتا رہا۔ لیکن آخر اُسے فوراً اپنی موجودہ حالت کا احساس ہوا۔ اپنے کام کا خیال آتے ہی اس نے اس حقیقت کو محسوس کرلیا کہ اس

ادبستان

نازنین نے دراصل اسکو دھوکا دیا ہے۔ اور چارلس کو غلط فہمی مین ڈالنے کے لئے اُس نے یونہی کوئی چیز باہر پھینک دی ہے۔ اور کنجی دراصل اس کے پاس موجود ہے۔ چارلس اسی خیال مین غرق تھا کہ نازنین کے سوال نے اُسے پھر چونکا دیا۔

نازنین.........۔ اَب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہین ؟ مین آپ کے لئے کیا کرون ؟

چارلس.........۔ مین صرف یہ چاہتا ہون کہ اس صندوق کی کنجی مجھے دیدو۔

نازنین نے چارلس کے ان الفاظ کو سنکر زور سے ایک قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔

نازنین.........۔ یہ ناممکن ہے ...... اس کے علاوہ کوئی اور خدمت ہو تو اس سے مطلع کیجئے۔

چارلس.........۔ کنجی مجھے ضرور دیدیجئے۔

نازنین.........۔ معاف کیجئے رات کو لوگون کے گھرون مین گھسنے والے دلیر چور! مجھے اس سے معاف کیجئے۔ آپ کو خود سوچنا چاہیے کہ آپ نے کس قدر خطرناک جرم کا ارتکاب کیا ہے ؟ کیا آپ اُس انجام کا اندازہ نہین لگا سکتے جو اس وقت اس قسم کے کام کرنے سے بھگتنا پڑتا ہے ؟ رات کے وقت دروازہ توڑنا۔ گھر مین گھس کر عورتون پر زیادتی کرنا۔ اور پھر چوری کی جرأت! کیا آپ ان تمام باتونکو ابھی تک کھیل سمجھ رہے ہین ؟

نازنین اپنی بات پوری کر چکی تو چارلس بجائے مرعوب ہونے کے ہنس دیا۔ اور نہایت بے پروائی سے کہنے لگا

چارلس.........۔ نہین ہرگز نہین۔ مین اس کے انجام سے ہرگز ہراسان نہین ہون۔ آپ خود میرے چہرے کی حالت سے اس امر کا اندازہ لگا سکتی ہین۔ کہ مین کہان تک خائف یا مطمئن ہون ؟ یہ آپ نے واقعی صحیح کہا ہے کہ رات کو قفل شکنی۔ ایک عورت کے گھر مین جا کر چوری کرنا بجائے خود ایک خطرناک کام ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ مین اس سے ڈر گیا ہون یا مجھے کوئی فکر لاحق ہو گئی ہے۔ یہ تو محض خیال ہی ہے۔ .... نازنین نے ایک نظر چارلس کو دیکھا اور کہنے لگی ....۔

نازنین.........۔ اچھا اب مقصد کیا ہے آپ کا ؟

چارلس.........۔ میرے مقاصد تو بہت سے ہین۔ ان مین سے ایک یہ بھی ہے کہ حکومت کے بحری افسر

کے متعلق جو کاغذات اس صندوق مین رکھے ہین وہ حاصل کرلون...... !

نازنین ......:۔ تم جو کچھ کہتے ہو اسکی اہمیت سے ناواقف ہو۔ تم نشہ مین تو نہین ہو۔ مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے دماغ مین کچھ فتور معلوم ہوتا ہے۔ یہ صندوق جو تمہارے سامنے رکھا ہے اس مین حکومت کی کوئی چیز کیون ہونے لگی؟ کیا گھر مین انسان اپنی قیمتی چیزون اور جواہرات کو محفوظ کرنے کے لیئے صندوق وغیرہ نہین رکھتا؟ اس مین تو میری ذاتی چیزین محفوظ ہین۔ کیا تم "سرکاری کاغذات" کا دہوکہ دیکر میرے جواہرات چرالیجانا چاہتے ہو۔ یہ فریب کسی اور کو دینا۔

چارلس ......:۔ آپ جو کچھ کہہ رہی ہین اگر یہ صحیح ہے اور آپ مجھے اپنے جواہرات کا چور سمجھتی ہین تو ٹیلیفون موجود ہے آپ پولیس کو کیون نہین بلالیتین !

نازنین ......:۔ (نہایت غصہ سے چارلس کو گھور کر) کیا واقعی تم مجھے پولیس کو بلانیکی اجازت دیتے ہو؟

چارلس........:۔ اجازت کیا میری تو خواہش ہے کہ آپ پولیس کو بلائین۔

نازنین.......:۔ تو مین پولیس سے مدد لون؟

چارلس.........:۔ ہان مگر صرف پولیس سے

نازنین..........:۔ اچھی بات ہے بلاتی ہون

نازنین اُٹھی اور ٹیلیفون کے پاس گئی۔ وہ ٹیلیفون کے ریسور کو اُٹھانا ہی چاہتی تھی کہ چارلس اسکی طرف بڑھا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے نازنین کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اور اب وہ چارلس کے بازوؤن مین بندھ گئی۔ یہان تک کہ وہ ہل نہ سکتی تھی۔

ناظرین کہتے ہون گے کہ چارلس نے ایک عورت پر دست درازی کی' چارلس خود کہتے ہین کہ واقعی ایک مرد کے لیئے یہ شایان شان نہین ہے کہ ایک عورت پر اپنی قوت و زبردستی کا استعمال کرے۔ اس لئے مین اس حرکت کا اعتراف کرتے ہوئے ناظرین سے ان الفاظ کے ساتھ معافی چاہتا ہون "الضرورت تبیح المحظورات" ضرورت سب کچھ کرواتی ہے۔ اس لیئے کہ اس نازنین

نے میری مخالفت اور زک دینے مین جس استقلال اور عناد کا ثبوت دیا تھا اسکو دیکھتے ہوئے زبردستی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا"

بہرحال نازنین اب بالکل چارلس کے قابو مین تھی۔ اور اس طرح کہ اس کا کچھ کر نہین سکتی تھی۔ چارلس نے اپنا دایان ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ اور اسکی عطر بیز خوشبو نے چارلس کو بےخود بنا دیا تھوڑی دیر تک وہ اس کی بوئے دل آویز سے بظاہر مدہوش سا ہوگیا۔لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ نازنین کے سینے کی طرف محض اس کی لطیف ترین صنعت کا مطالعہ کرنے کے لئے نہین بڑھا تھا۔ بلکہ اس مجاز مین ایک حقیقت پنہان تھی۔یعنی کچھ دیر کے بعد چارلس کا ہاتھ جب واپس آیا تو وہ خالی نہین تھا۔بلکہ اس مین صندوق کی کنجی تھی جو اپنی قیمت و قدر کے لحاظ سے نازنین کے سینۂ صافی کے قرب وجوار (جیب) مین نہایت حفاظت سے رکھ دی گئی تھی۔

اس تمام کارروائی مین چارلس کے کان مین کچھ آواز سنائی دیتی رہی۔ جسکو غور سے سننے سے حسب ذیل الفاظ سمجھ مین آتے تھے "اے بزدل انسان! اے عورت پر ہاتھ اُٹھانیوالے ننگ انسانیت!"

آخر چارلس نے نازنین کو چھوڑ دیا۔ اور وہ پاس کی کرسی پر پڑ رہی۔ اس کے چہرہ پر خوف و ہراس کی وجہ سے زردی سی چھا گئی تھی۔ چارلس کو اس کے بیہوش ہو جانے کا یقین ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس پر بھی بیخودانہ خاموشی طاری رہی۔ آخر اُس نے لڑکھڑائی ہوئی آواز سے یہی لفظ دہرانا شروع کئے کہ "اے نامردے! اے بزدل آدمی!"

چارلس نے ان الفاظ کی پرواہ نہ کی۔کیونکہ وہ اپنی کامیابی کے نشہ مین سرشار تھا چارلس (اسکی طرف دیکھ کر) ابھی تک تم پولیس کو بلا کر مجھے گرفتار کرا سکتی ہو۔ پھر بلاتی کیون نہین ہو؟ یہ کہہ کر چارلس صندوق کی طرف لپکا۔ اور نازنین کی طرف پیٹھ کر کے اس کا قفل کھولنے لگا۔ وہ قفل کھولنے مین مصروف تھا کہ نازنین نے یکبارگی ایسی حرکت کی کہ چارلس کی رگون کا خون خشک ہوگیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا کہ وہ عورت، اپنے گم شدہ بچون کو دیکھ کر ایک لپکنے والی شیرنی یا چیتے کی طرح اس پر جھپٹی......!

یہ بتلانے کی ضرورت نہین کہ اس کے بعد دونون مین کس قسم کی دھینگا مشتی ہوئی اور

چارلس نے اسکو کنجی حاصل کرنے کی کوشش مین کس کس طرح ناکام کیا۔ القصہ چارلس جب اس پر غالب آ گیا تو اُسے صندوق سے ایک طرف کھڑکی کے پاس کھینچ کر اس طرح بے دست و پا کرکے کھڑا کر دیا کہ وہ بالکل نہین ہل سکتی تھی ۔.........؛

اب نازنین کے چہرہ پر مایوسانہ غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ اس نے چارلس پر ایک حاسدانہ نظر ڈالی اور پھر آنکھین نیچی کرلین ۔ اور چارلس کو پھر ایک دفعہ اس کے دشمن شکن حسن و جمال کو غضبناک شکل مین دیکھنے کا موقعہ ملگیا ۔ چارلس نے اندازہ لگایا کہ وہ کس طرح محض دھمکی دینے کی غرض سے اپنے مدمقابل کو مسخر کرلیتی ہوگی ۔ مایوسی اور مجبوری کے بعد دونون نے حسب ذیل گفتگو شروع کی:......

نازنین.........: (چارلس کے ہاتھ کو پکڑ کر درخواست اور نرمی کے انداز سے) ٹھہرو! ذرا ٹھہرو! زبردستی کیون کرتے ہو۔ اگر صندوق مین تمہارے مطلب کی کوئی چیز ہوگی تو خود بخود تمہین دے دون گی۔

چارلس..........: صندوق مین تو میرے مطلب کی بہت سی چیزین ہین ۔

نازنین.........: (جو ابھی تک چارلس کے ہاتھ کو تھامے ہوئے تھی) لیکن آخر تم ان چیزون کے پیچھے کیون پڑ گئے ہو ؟

چارلس..........: میرا فرض یہی ہے ۔ مین انہی چیزون کے لئے بھیجا گیا ہون۔ انہی کی خاطر اتنی دیر سے تمہاری تاک مین لگا ہوا تھا۔ اور اسی غرض کے لئے مین اس شخص کی نقل و حرکت کو بغور دیکھتا رہا جس نے تم کو یہ بنڈل دیا ہے ۔

نازنین..........: بنڈل ؟ بنڈل کونسا ؟

چارلس.........: وہی پلندا جو ایک گھنٹہ ہوا ٹرفیلگر میدان مین اس شخص نے تمہین دیا تھا! اور اگر مزید تفصیل کی ضرورت ہو تو مین تمہین اُن چیزون کی فہرست بھی بتا سکتا ہون جو اس بنڈل مین بند ہین۔

نازنین.........: تمہین بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے ۔ دیکھو! تم اس قدر عظیم الشان غلطی کر رہے ہو

(باقی آیندہ)

زمزمۂ تغزل

(از مولانا مسعود الرحمن خانصاحب۔ اثر)

یہ دل بہی وقفِ شیون ہے ابہی درد آشنا ہوکر
مزا تب تہا کہ رگ رگ بول اُٹھتی ہمنوا ہوکر

وہ صورت جو کبھی کاشانۂ حسرت کی زینت تہی
وہ ابتک آنکھ مین پہرتی ہے تصویرِ وفا ہوکر

قیامت دیکھئے کل تک جو گلزارِ تمنا تہا
وہ افسردہ ہوا آخر دلِ بے مدعا ہوکر

دمِ آخر ہوا دی تہی جو تم نے اپنے دامن سے
ہوئی ہے منتشر عالم مین وہ بوئے وفا ہوکر

نگاہِ شوق سے بہر وہ تکنا روئے زیبا کو
نزار و پوش ہوجانا وہ مدہوش حیا ہوکر

جسے آنکہون نے دیکہا تہا کبہی آغازِ الفت مین
وہ اب بہی دل مین روشن ہے چراغِ مدعا ہوکر

زبانِ آرزو چپ ہے تو چپ ہونے سے کیا حاصل
کہین کی رازِ الفت میری آنکہین مدعا ہوکر

جمالِ یار کا نظارہ محشر کا نمونہ تہا
عجب حالت ہوئی آنکہونکی اُنکا سامنا ہوکر

یہ قسمت ہے کہ آغازِ جنون مین رنگ لے آئین
محبت کی نگاہین ہی تو جرم ناسزا ہوکر

تمنا نکلے چشمِ آرزو مین جلوہ گر ہونا
پہر ان کا دل مین چھپ رہنا نشانِ مدعا ہوکر

یہ سنتے تہے انہین ایفائے وعدہ سے محبت ہے
نہ جانے کیون ہوا انکار اقرارِ وفا ہوکر

اثر کچھ یاد بہی ہے وہ زمانہ جوشِ الفت کا!
یہ آنکہین جب بچھی تہین اُس گلی مین نقشِ پا ہوکر

لطیفہ

شاعر...... دنیا پیدا ہی نہین ہوئی۔ اس خیال کو مدنظر رکھکر مین نے یہ نظم لکھی ہے

اڈیٹر...... یہ بات ہے!! تو پہر آپ نظم لکھتے وقت کہان تھے ؟

شاعر.................. اپنی کرسی پر!

تعارف

سُہیل :- یہ سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے جناب رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) کی ادارت مین شایع ہوتا ہے۔ حجم ۵۲ صفحہ۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ نفیس تختی ۸ × ۱۰ قیمت سالانہ عـہ/ فی پرچہ ڈیڑھ روپے .... لایق اڈیٹر نے دلچسپ مضامین جمع کرنیکی بڑی حدتک قابل ستایش سعی کی ہے۔ علاوہ شذرات کے سات ادبی وعلمی مضامین ہین جن مین زیادہ تر ادبیات پر ہین ایک دلچسپ فسانہ بہی ہے جو رسالہ کی امتیازی خصوصیت کے مطابق ہے۔

البتہ ایک مضمون فارسی زبان مین علی گڈہ مسلم یونیورسٹی کی اسلامی تعلیمات کے متعلق لکھا گیا ہے لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ فاضل نامہ نگار کو زبان فارسی مین اظہار خیال کے لئے کونسی خاص ضرورت داعی ہوئی جہانتک مضمون کے مطالب کا تعلق ہے غالباً اردو کی موجودہ وسعت اس کیلئے ناکافی نہ تہی اس معمہ کو جناب اڈیٹر صاحب نے بہی حل نہین فرمایا۔

بابو گنجیت سرنداس ایل ایل بی کے مضمون مین جو جابجا عامیانہ حملے مسلمانون پر کئے گئے ہین وہ کسی طرح قابل نظرانداز نہین۔ اگرچہ جناب مدیر نے بجا طور پر اُنکی گرفت کی ہے لیکن پہر بہی ایسے مضامین کی اشاعت سے سہیل کے مقدس مقاصد کو ٹھیس پہونچنے کا سخت اندیشہ ہے۔ جہانتک ہو ایسے افادات سے احتراز ہی بہتر ہے۔

اسی نمبر مین مسٹر سید محی الدین صاحب قادری کا ایک مضمون " اردو کے اسالیب بیان " پر پوری کاوش ومحنت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جہان مضمون نگار نے موجودہ اہل قلم پر دقت نظری کے ساتھ تنقید کی ہے وہین بعض ایسی فاش غلطیان بھی کی ہین جو باعثِ تعجب وحیرت ہین۔ زور صاحب اپنے زور بیان مین ایک جگہ مولانا ابوالکلام پر اردو مین عربیت آمیزی کی دفعہ جرم عائد کرتے ہوئے رقمطراز ہین کہ۔

" معلوم ہوتا ہے کہ ابوالکلام کی مخصوص ذہنیت نے سرسید کی اصلاحی کوششون کے لئے ردِّ عمل کا کام کیا۔ اُن کا

اور اُن کے مقلدین کا غالباً یہ عقیدہ ہے کہ اردو زبان میں مذہب اسلام کی جملہ اصطلاحات اور اسکے متعلقہ عربی و فارسی لفظوں کو بالکل بے تکلفی سے استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ مسلمان اُن سے ہر وقت دو چار ہوتے رہیں اور اس طرح اُن کے مذہبی معتقدات موقع بموقع تازہ ہوا کریں۔"

اگر فاضل مضمون نگار اپنی نکتہ چینی صرف مولانا ابوالکلام کے طرز تحریر تک محدود رکھتے تو یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ یہ موصوف کی ذاتی رائے ہے۔ لیکن انہوں نے نیتوں اور عقاید کے انکشاف و جہاں بین کی اہم ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی ہے۔ نیز ان کی یہ رائے کہ:۔

"مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالسلام ندوی، اور نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی تینوں شبلی کے اسلوب بیان کے متبع ہیں مگر علامہ شروانی کی تحریریں بہ نسبت اول الذکر انشاپردازوں کے زیادہ بانکی اور شگفتہ ہوتی ہیں"

بہت کچھ غور و احتیاط کی محتاج ہے۔

باوجود ان چند باتوں کے پورا مضمون گہرے مطالعہ کا مستحق ہے۔ زور صاحب نے نہایت اعتدال و احتیاط کے ساتھ موجودہ اہل قلم پر اظہار رائے فرمایا ہے بالخصوص بحوالہ جناب اصغر گونڈوی انکی یہ رائے بالکل صحیح و صائب ہے کہ

"آجکل اردو اسلوب کا ایک زبردست رجحان لطیف نگاری کیطرف ہے۔ یہ رجحان مولانا ابوالکلام کی طرز انشاپردازی اور سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی نظموں کے اردو اسلوب کے عناصر سے مرکب ہے۔ اگرچہ ہر ترقی یافتہ زبان میں اس قسم کی طرز تحریر کا کبھی نہ کبھی پیدا ہونا لازمی ہے لیکن ابھی اردو پوری طرح اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس میں اس قسم کی انشا کثرت کے ساتھ رواج پاتی۔ اردو کو سنجیدہ نگاری اور علمی مضامین میں ابھی بہت کچھ ترقی کرنی ہے۔ اور افسوس ہے کہ بہت پہلے ہی اس میں اس نوع کا اضافہ اور وہ بھی حد اعتدال سے زیادہ ہونا شروع ہو گیا۔"

غرضکہ زور صاحب کی دیدہ ریزی اور تحقیقی کاوش سزاوار ستایش و تحسین ہے۔ اس سے اردو کے اسلوب بیان کے متعلق بہت کچھ استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سب سے آخر اور غالباً سب سے بہتر مضمون جناب رشید احمد صدیقی مدیر رسالہ کا ہے۔ جو شعر و شاعری پر نہایت تحقیق و امعان نظر کے ساتھ لکھا گیا۔ یہ دراصل دیوان فانی کا مقدمہ ہے

اس مضمون پر خصوصیت کے ساتھ ہمارے نوخیز شعرا کو غور و توجہ کرنا چاہیے۔ اور جس قدر باتین قابل ہون انکو بجائے غیض و غضب کی نذر کرنے کے اپنے مین جذب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اس ضمن مین مضمون کے بعض دلچسپ حصون کی طرف توجہ دلانا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

موصوف نے موجودہ نوخیز شعرا کی بے راہ روی اور ان کے طبقون کی تقسیم کرتے ہوئے بعض بے حد مفید باتین لکھی ہین۔ جنپر ہی خواہان اردو کو ہمدردی کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے۔

"آج کثرت سے ایسے شعرا ملینگے جنکو الفاظ اور اوزان پر غیر معمولی قدرت ہوتی ہے ان کے ذہن مین کوئی خیال نہین ہوتا۔ چونکہ الفاظ و تراکیب پر قدرت ہوتی ہے وہ بلا تامل انکو مختلف طور پر ترتیب دے دیتے ہین اور بعد مین دیکھتے ہین تو ان مین معانی و مطالب بہی پا جاتے ہین۔ اسکے علاوہ بعض الفاظ اور فقرہ ایسے ہین جنکو کسی نہ کسی طور پر کہین نہ کہین رکھدیجئے ایک طرح کا مترنم موہوم اور غیر متعین مفہوم خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ و فقرات کے معنی و مطالب پر غور کرنیکی شاعر کو ضرورت نہین محسوس ہوتی کیونکہ سامعین کا زیادہ حصہ ایسا ہوتا ہے جو ان الفاظ پر محض بربنائے عقیدت یا لاعلمی سر زنی کے لئے تیار رہتا ہے ان مین سے بعض الفاظ یہ ہین

"بادۂ عرفان ..... عہد الست ..... برق طور ..... وادی ایمن ..... ترانۂ منصور ..... خمار ہستی

خواب عدم ..... صبح ازل ..... خواب زلیخا ..... فریب ہستی ..... طلسم مجاز۔ آبلہ پا جنون خرام عزم و جوہر وغیرہ

دوسرا گروہ ایسا ہے جو لکھنے سے پہلے سوچتا بہی ہے لیکن ان کے تصور و تخیل کی دنیا وہی فرسودہ و پامال زمین ہے جسپر ہزارون قافلے گذر چکے ہین یہ طبقہ عموماً بڑے بڑے شعرا کے نتائج فکر کو سامنے رکھکر خیال آرائی کرتا ہے۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اساتذہ کے الفاظ اور بندشون کی نقل تو کسی حد تک کر لیتے ہین لیکن خیالات کی وسعت اور عمق کو نہین پہونچتے۔ کبھی صورت حال برعکس ہوتی ہے۔ ان لوگون کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ ہم اساتذہ کے مد مقابل ہین۔ حالانکہ یہ ان کی نفسیاتی غلطی ہے .... "

آج کل زیادہ تعداد ایسے شعرا کی ہے۔ جن کا مبلغ علم ناکافی ہوتا ہے۔ شاعری کے لئے یہ بہی نہایت ضروری ہے کہ کم از کم ایک سے زیادہ زبانو نپر عبور ہو۔ اردو کے قدیم اساتذہ فارسی اور عربی مین کامل مشق و مہارت رکھتے تھے۔ موجودہ دور مین صرف اردو سے واقف ہونا شاعر بننے کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔

اردو کو ابھی بہت زیادہ ترقی کرنیکی ضرورت ہے۔ جو صرف اس طور پر پوری ہو سکتی ہے کہ ان ادبیات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا جائے۔ اور اس طور پر حاصل کئے ہوئے نتائج یا تاثرات کو احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ اردو نظم و نثر مین اس طرح منتقل کیا جائے کہ ایک طرف بے معنی نقالی نہ ہو۔ اور دوسری طرف وہ محاسن اُردو ادب مین اس طور پر جذب ہو جایئن۔ کہ بالکل فطری اور اصلی معلوم ہون۔ لیکن یہ حق ترجمانی صرف اسوقت ادا ہو سکتا ہے۔ جب ہم مطالعہ کتب، مطالعہ فطرت اور وسیع النظر ارباب ذوق کی صحبتون سے مستفید ہون پہلے لوگ اگر خود شعر و سخن کا شغل نہین رکھتے تھے تو کم از کم شعراء و علماء کی صحبتون کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس سے طبیعتین سلجھتی تھین۔ اور سوسائٹی کا مذاق نکھرتا تھا۔ اس لئے ہر شاعر کے لئے لازمی ہے کہ اُسے مختلف زبانون پر عبور ہو۔ اور ان لوگون کے فیض صحبت سے مستفید ہو جو اس وادی کے نشیب و فراز سے آشنا ہین اور ایک حد تک قطع مسافت کر چکے ہین۔ نظم و نثر مین کامیابی و کمال حاصل کرنے کے لئے ارباب ذوق و بصیرت کی صحبت محض اس خیال سے ضروری نہین کہ اپنے کلام پر ان سے اصلاح لیجائے۔ یا ان سے کسی کتاب کا درس لیا جائے یا معلومات کا سرمایہ فراہم کیا جائے۔ حقیقتاً یہ چیزین زیادہ ضروری نہین ہین۔ ان سے محض ایک طرح کی عقیدت رکھنا اور اکتساب علم و ہنر مین ان کی طرف سے بے توجہ نہ ہونا۔ ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا گفت و شنید۔ مزاح و تفریح وغیرہ ایسی چیزین ہین جن کا اثر اتنا گہرا اور مفید ہوتا ہے کہ آپ سالہا سال صرف مطالعہ کتب مین مصروف رہین۔ وہ باتین میسر نہ آئینگی۔ مطالعہ کتب کا مقصد محض ذخیرہ معلومات کی فراہمی ہے۔ مگر ارباب بصیرت کے فیض صحبت سے ان معلومات حاصلہ کی صحیح ترتیب آجاتی ہے اور حصول معلومات کا صحیح طریقہ کار معلوم ہو جاتا ہے۔ اور ذخیرہ کتب مین جو سرمایہ فراہم ہے اُن کے متعلق اخذ و ترک کا صحیح ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات نہایت معمولی اور ایک حد تک مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جن لوگون کو اس کا تجربہ ہے وہ جانتے ہین کہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس سے مطالعہ مین کتنا لطف آتا ہے۔ اور مطالعہ کا مقصد اس سے کس حسن و خوبی سے پورا ہوتا ہے۔ بسا اوقات پان پانسو صفحات کی کتاب مین صرف نصف درجن جملے یا الفاظ ایسے ملینگے جن سے مطالعہ کی ساری کلفتین دور ہو جاتی ہین۔ اور ان الفاظ و فقرون سے ایسی بصیرت اور ایسا انشراح صدر نصیب

ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

موجودہ دور میں اردو نظم و نثر میں جو انقلابات گذر رہے ہیں ان کو دیکھکر ہم میں سے بعض لوگ خوش ہوتے ہیں۔ بعض کڑہتے ہیں۔ بعض انگشت بدنداں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسوقت تمام دنیا نئے نئے خیالات اور نئے نئے تجربات کے ورطہ میں ہے اور ایک نامعلوم لیکن موثر طریقہ پر ہمارا ذہن و دماغ ان سے متاثر ہو رہا ہے۔ قدیم و جدید کے تصادم سے جو شعلہ اُٹھتا ہے اُس نے بہتوں کی نگاہ خیرہ کر دی ہے۔ اُردو شعر و شاعری بھی اسی زد میں ہے۔ وہ لوگ جو ان جدید خیالات اور افکار سے متاثر ہو چکے ہیں یا لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اردو شعر و شاعری کو اسی معیار سے جانچتے ہیں اور قدرتی طور پر مایوس ہوتے ہیں۔

راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ شعر و شاعری میں کثرت کے ساتھ ایسے الفاظ شامل ہو گئے ہیں جنکا مفہوم غیر متیقن ہے۔ اور بیشتر اسوقت ایسی ترکیبیں استعمال کیجاتی ہیں جب شاعر کو خود اپنا مفہوم متیقن نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات تعین و تفصیل کی جگہ اجمال و ابہام خود حسن شاعری کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ بلکہ شاعری کا کمال تو یہ ہے کہ سننے کے ساتھ قلب و دماغ پر ایسی کیفیت طاری ہو کہ اس عالم بے خودی میں جزئیات سے بے التفاتی ہو جائے۔ اور نقایص شعری (اگر ہوں) نظر انداز ہو جائیں۔ لیکن کم درجہ کے شعرا اور اکثر بلند پایہ اصحاب فکر بھی اس رعایت یا خصوصیت سے فائدہ نہیں بلکہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ اور شعر و شاعری پر اس کا نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔ بسا اوقات فضائے تخیل میں ایک جدید خیال کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ اور ہم قبل اس کے کہ خود اس خیال کے حدود معین کریں۔ اسکی پوری وسعت اسکی صحیح گہرائی اور اسکے حقیقی وزن پر التفات کریں۔ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہمارے ذخیرہ الفاظ میں کونسا لفظ ایسا ہے، جو کسی نہ کسی حد تک ہمارے اس کارنامہ (فکری) کا احاطہ کر سکتا ہے اور آسانی کے ساتھ مل سکتا ہے اس معاملہ میں ہم تفتیش و جستجو سے بھی بچنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ الفاظ پر غور کرنے سے پہلے ہم کو اپنے خیالات پر عبور حاصل کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد سوچنا چاہیئے کہ ہمکو کونسا لفظ لینا چاہیئے۔ یا ان خیالات

کو ظاہر یا واضح کرنے کے لئے کیا پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہئے۔

آرٹ۔ ان دنون آرٹ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک نااہل نے اپنی نظم و نثر مین غلو اضداد یا حیا سوزی کو کہان تک دخل دیا۔ آرٹ کے اس مفہوم نے سخت گمراہی پہیلا رکہی ہے۔ اردو ادب مین اسوقت جو فرسودگی یا ابتذال نظر آرہا ہے۔ اس کا راز آرٹ کے علم برداروں کی حیا سوز دلیری مین ملسکتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہمارے ذہن۔ زبان۔ قلم یا اور کسی مصنوعی آلہ سے جو کچھ بر آمد ہو وہ عین فطرت ہے۔ اور یہی آرٹ ہے۔

اس توضیح کے بعد آرٹ کی تعریف یہ رہجاتی ہے کہ انسان کا ہر وہ کام آرٹ مین داخل ہے جو قوت فکر و فیصلہ دونون کے استعمال کے بعد اس طرح پر پورا کیا جائے جس کے سوا اس کے انجام کا کوئی دوسرا طریقہ یا تو ممکن نہین یا وہ کام دوسرے طریقہ پر کئے جانے کے قابل نہ تہا۔ گویا اس مقصد کی تکمیل اسی خاص انداز مین کرنا خود منشار فطرت تہا۔ یہان یہ معلوم ہوگا کہ آرٹ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسانی پرواز کو فطرت تکوین سے کہانتک ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور یہ منصب کتنا بلند کتنا مشکل، اور کن ذمہ داریون کا حامل ہے"

رسالہ مین تصویر اور نظمون کا بہی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ علاوہ ادبیات کے تاریخی و تعلیمی وغیرہ مضامین بہی جمع کئے جائین۔

فی الجملہ رسالہ قابل قدر ہے۔ توقع ہے کہ ہمارے ملک کے مشہور اہل قلم اڈیٹر کی ادارت مین یہ رسالہ جلد اس معیار پر پہونچ جائیگا جو بلند پایہ مسلم یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ ملک کو نہایت فراخ حوصلگی کے ساتہہ اس ہونہار آرگن کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

تذکرہ قوم کوکنی حصۂ اول مصنفۂ عبدالحمید خان صاحب بوبیرے۔ قیمت چھ آنے۔ ملنے کا پتہ عبدالحمید خان بوبیرے۔ بلاسس روڈ۔ جامع مسجد بلڈنگ بمبئی نمبر ۸۔

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ زیر تبصرہ پہلا حصہ ہے۔ دیگر حصص زیر تالیف ہین۔ ۵۶ صفحات مین جو کچھ معلومات جمع ہوسکی ہین کی گئی ہین۔ ہم نہین کہہ سکتے کہ فاضل مصنف اس کوشش مین کہان تک کامیاب رہے۔ اس لئے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اکثر و بیشتر واقعات محض

سنی سنائی باتون سے تعلق رکھتے ہین۔ جنکی اصلیت کا کوئی ثبوت نہین ہے۔ ہمین امید ہے کہ دوسرے حصے زیادہ صحت و تحقیق کے ساتہہ لکہے جائینگے۔ کتابت وطباعت نہایت عمدہ ہے۔

تربیت مترجم عبدالحمید صاحب نعمانی۔ قیمت دو آنے۔ پتہ سکرٹری محفل تحفۂ رسالت شبدی محلہ بمبئی نمبر ۹۔ .... چھوٹی سایز کے ۲۲ صفحات کا رسالہ ہے جس مین چھوٹی مسلمان بچیون کے لئے عمدہ اخلاقی نصایح جمع ہین۔ قابل مترجم کے بیان کے مطابق یہ رسالہ مصر کی ایک ادیب خاتون کی مذہبی و اخلاقی تصنیف کا بہ تصرف ترجمہ ہے۔ کتاب اچھی اور نصاب تعلیم مین داخل کرنے کے لایق ہے۔ لکہائی چھپائی بہی اچھی ہے۔

(خلیل احمد سیکروی)

نسائیات

خود غرضی

(از محترمہ رابعہ خاتون صاحبہ پنہان)

خود غرضی نام ہے اُس جذبۂ سیئہ کا جس کا آغاز خون شرافت، اور انجام ذلت و تذلیل کی آخری منزل ہے۔ یہ وہ مذموم جذبہ ہے جس کے افسوسناک اثر سے نہ صرف طرف اول متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ جانب ثانی کے لئے بھی موجب ضرر ہے۔ فی زمانہ خود غرضی کی مسموم ہوائین ہر متنفس پر اپنے زہریلے تاثرات پہیلا رہی ہین۔ ہر ہستی غرض کی مرید اور ہر انسان دوسرون سے مطلب براری کا خواہان ہے۔ لیکن جس وقت میزان امتحان شخص مذکور کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ اُسوقت توازن توکجا، ایک پلہ بجانب زمین، اور دوسرا الطرف آسمان چلا جاتا ہے۔ اور ممتحن قدرت کی نگاہین دیکھتی ہین کہ تملق و چاپلوسی کے وہ تمام خزانے جو اپنی حاجت روائی کے وقت پُر کئے گئے تھے محض خالی پڑے ہین۔ اور عجب حاجت روا جو اپنی نیک نفسی اور مطلب برآری کے کارہائے مستحسن سے مسرور و بے فکر تہا خجالت و بے اعتباری کی لہرون مین جھکولے کھانے لگتا ہے۔ اُس کا وہ دل جواب تک شریفانہ جذبات اور بے بہا خیالات سے مملو تہا۔ روش زمانہ سے چُور ہو کر مجبور ہو جاتا ہے اسی روش پر عمل پیرا ہو جانے پر

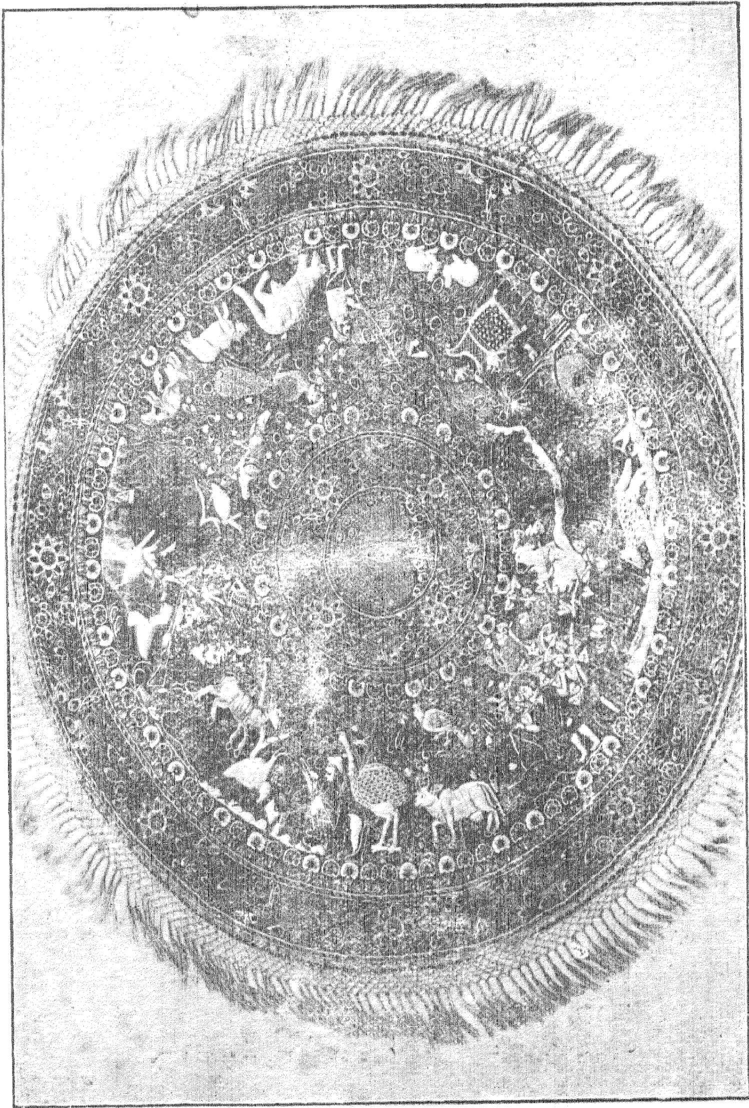
وقت کی رفتار سے ہو ہو کے دل مین منفعل
بے گناہی سے کہین توبہ نہ کرلین اہل دل

اور یہی قوم کی ذلت و نکبت کا اصلی راز ہے۔ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ نکوہیدہ افعال کا وہ

مسٹر شعیب قریشی



جو ہندوستان میں ہوامر اسلامی کے سکریٹری ہیں



بڑودہ کی دستکاری کا نمونہ

مرتکب جو دوسرون کو بھی ترغیب دیتا ہے۔ غلط راستہ پر چلنے کی گناہوں کے کتنے زبردست بارکا حامل ہے؟ .... خودغرضی ایک ایسا شعلہ مشتعل ہے۔ جس کی آتش بداماں لپٹین آسایش و راحت کے خرمن مسکن کو یکسر خاکستر بنا دیتی ہین۔ اور ایسا طوفان آفرین بحر ذخار ہے جس کی غضبناک لہرین ایک زبردست سلطنت ایک مستقل حکومت کو نکبت و ادبار کی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش کر دیتی ہین۔ ایک پرسکون حکومت مین، ایک پرامن خاندان مین، ایک راحت بدوش گھر مین خودغرضی ہی وہ خنجر ہلاہل زا ہے۔ جس کی برش طمانیت و آسایش کے سینۂ سکون کو صد پارہ کر ڈالتی ہے۔ جو ہستی اپنے اغراض و مقاصد کی کنیز ہے اور جو انسان دوسرے انسان کی تکالیف سے متاثر اور انتشار سے آزردہ نہین ہو سکتا وہ حقیقی معنون مین انسان کہلائے جانے کا مستحق نہین۔ کیونکہ فطرت نے تخلیق کائنات کو ایک دوسرے سے اس طرح منسلک کر دیا ہے۔ جس طرح سورج سے روشنی۔ پس وہ ہستی جو اس رشتۂ متحد کو علیحدہ کرنے مین کوشان ہے۔ ایک مضحکہ خیز و ہلاکت آمیز غلطی کا ارتکاب کرتی ہے۔ اور خودغرضی ہی وہ تیز مقراض ہے جو اس رشتہ کو علیحدہ کرنے کا ذریعہ ہے۔

ہم مستورات کے اس طبقۂ نسائی کو جس کی فطرت مین قدرت نے بہترین جذبات ودیعت کئے ہین۔ اس نکوہیدہ جذبہ سے اس طرح محترز رہنا چاہئے جس طرح آسمان سے زمین کیونکہ یہی سبب ہلاکت قوم ہے۔ اور مستورات ہی کے خیالات و جذبات پر قومی عظمت و منزلت کا انحصار ہے۔

غزل

(از جناب پروین صاحبہ)

کچھ اس کے منانے مین الجھن تو نہین ہے
دنیا کوئی روٹھی ہوئی دُلہن تو نہین ہے

جب چاہینگے دیکھینگے تجھے معبد دل مین
دشوار کچھ ایسا ترا درشن تو نہین ہے

جاتے ہین سوئے ملکِ عدم اتنا بتا دو
اس راہ مین دل کا کوئی رہزن تو نہین ہے

بے دیکھے ہوئے حور و نہ دے جان جو اے شیخ
دیوانہ تری طرح برہمن تو نہین ہے

بجا ہے کرین اب بہی اگر آپ شکایت
خاموش ہے دل مائل شیون تو نہین ہے

کس طرح بہلا چاک مقدر مین رفو ہو
تدبیر تخیل کوئی سوزن تو نہین ہے

غزل

(از جنابہ زینب بی بنت علی اکبر صاحب)

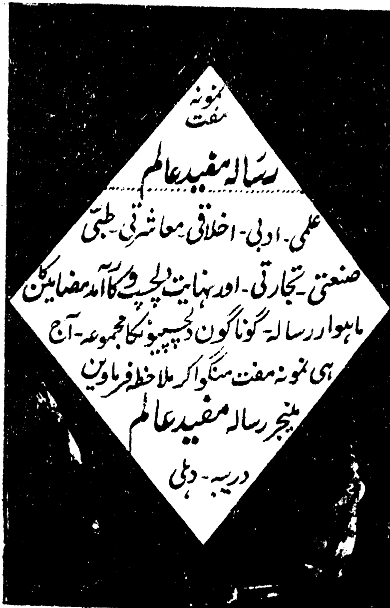
اللہ اللہ بیخودی بھی کیا تحیر خیز ہے
جلوہ ہائے عالم حیرت سے دل لبریز ہے

دل کی ہستی کا مین احساس تعبیر کیا کرون
اب تو اس کا اُف تصور ہی جنون انگیز ہے

محو حیرت ہون مین جب سے کہل گئی ہے میری آنکھ
ہر جھلک رنگ مجازی کی حقیقت ریز ہے

کر رہا ہے تجھ سے باتین بیخودی شوق مین
تیرے دیوانہ کی تنہائی بھی لطف انگیز ہے

دل ہوا ہے جب سے لذت گیر نشتر ہائے غم
ہر نفس ذوق جراحت مین تپش انگیز ہے



تازہ بتازہ نو بنو

غزل

(از محمد عبد الحمید خان حمید مدرس۔ تلمیذ حضرت جگر صدیقی)

ہو کشتگان عشق نبی مین شمار بھی
حسرت یہ ہے بنے اسی در پہ مزار بھی

وہ دن خدا دکھائیگا کب یا رسول پاک
پیش نظر ہو تم بھی تمہارا دیار بھی

سینہ مین داغ عشق نبی لیکے ہم چلے
روشن رہیگا حشر تک اپنا مزار بھی

آئین جو روز حشر شفاعت کو مصطفیٰ
دامن سنبھالے ساتھ ہو یہ خاکسار بھی

نعت نبی کے پڑھنے سے ہو جائیگا حمید
عشاق مصطفیٰ مین تمہارا شمار بھی

غزل

(از جناب منصور۔ فیض آبادی)

آئے ہین کب جب آئی ہے لینے قضا مجھے
موقع ملا ہی کوئی تو بیٹھے ہب ملا مجھے

مانع ہے لب کشائی سے میری حیا مجھے
کیا دیکھئے دکھاتا ہے ذوق وفا مجھے

اُلٹی ہمیشہ حضرت دل نے دکھائی راہ
تقدیر سے عجیب ملا رہنما مجھے

لیجائے دیکھون کسطرف اب جوش اضطراب
لینے کو آرہی ہے جنون کی ہوا مجھے

حق بولنا گناہ تھا منصور دہر مین
بالائے دار جاکے یہ عقدہ کھلا مجھے

غزل

از محمد یوسف صاحب جنرل کلرک - واڑی بندر بمبئی

درد فرقت مین مبتلا کر کے — چلے مجھ سے نظر چرا کر کے

منہ چھپایا جھلک دکھلا کے مجھے — بیوفائی کیا وفا کر کے

مجھکو گرداب غم مین ڈال دیا — بحر الفت سے آشنا کر کے

ظلم حد سے سوا لگا کرنے — وہ فسونگر ذرا ذرا کر کے

بتکدہ سے چلے ہین کعبہ کو — شیخ صاحب خدا خدا کر کے

آئے دنیا مین کس لئے تھے ہم — اور اب جا رہے ہین کیا کر کے

دل جو مانگا تو ہم نے جان بھی دی — جھٹ سے دونو کو ایکجا کر کے

چارہ ساز و مریض عشق ہون مین — فائدہ کیا مری دوا کر کے

کیا ملے گا ستم شعار تجھے
یوسف خستہ پہ جفا کر کے

